ISSN 0974-7346

اپریل ۲۰۲۴ء
جلد ۲۱۱ — عدد ۴

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY,

AZAMGARH

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۳۵۰/روپے۔ فی شمارہ ۳۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴/روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰/روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰/روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰/روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۳۵۰/روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔

اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

(Ma'arif Section) 06386324437

Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۱ ماہ رمضان المبارک ۱۴۴۵ھ مطابق ماہ اپریل ۲۰۲۴ء عدد ۴

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
e-mail:
info@shibliacademy.org

شذرات

شہر رمضان کے ایام معدودات کا قریب نصف حصہ گزر چکا ہے۔قرآن مجید کے نزول اور انسانیت کے لیے سب سے جامع نامۂ ہدایت اورحق و باطل کے فرق کے اظہار کی سب سے روشن دلیل عطا کیے جانے کا فطری تقاضا ہے کہ ہلال رمضان کے دیدار سے مسرتوں اور برکتوں کی امیدیں وابستہ کی جائیں۔ ہمارے اسلاف تواس ہلال کی پیشانی پر پیام عید کی تحریر دیکھ لیتے اوراس کی شام کو صبح عیش کی تمہید سمجھ لیتے۔مگرادھرایک عرصہ سے عالم یہ ہے کہ یہ جس افق پر نمودار ہوتا ہے اس کی سرخی شفق گوں سے زیادہ لہورنگ نظرآتی ہے۔کبھی امت مرحومہ کی آئینہ دیواری اور بارشِ سنگِ حوادث کا تماشا بلکہ تلازمہ سمجھنادشوارتھامگراب فلسطین،غزہ،شام اورکچھ بے نام بستیوں میں انسان نے جس طرح خودکو بہائم میں شامل کیاہےاس کے بعدرمضان اورعید کے چاند سےاس کے سوااورکیا کہا جاسکتا ہے کہ:

صورت آئینہ سب کچھ دیکھ اور خاموش رہ شورش امروز میں محو سرود دوش رہ

پہلے بھی ہلال رمضان نے کیسے کیسے آسمان دیکھے ہوں گے۔پھراس کے افق کا یہ خونی رنگ ہمیشہ یوں ہی تونہیں رہنے والا۔

***

ادھرملک عزیز میں آثار یہی ہیں کہ کہیں ملک کا آئین،اس کا نظامِ جمہوریت،اس کا وفاقی نظم، انتظامیہ کے آزاد ادارے اورزندہ رہنے کے بنیادی انسانی واخلاقی حقوق کے سارے پیراہن اسی لہو رنگ میں ڈوب نہ جائیں۔اندیشے اتنے زیادہ ہیں کہ جمہوریت کے تمام رمزشناسوں کی زبانوں سے الفاظ ڈھلنے لگے ہیں کہ آئین ہند کی عملداری کے دن بس اب کچھ ہی رہ گئے ہیں۔ایسے میں عام پارلیمانی انتخاب کے اعلان نے روایتی جوش وخروش سے زیادہ ایک اضطراب اور بے چینی کی کیفیت طاری کردی ہے۔الیکشن کا موضوع،سیاسیات کی کتاب کا ظاہر ہے اہم باب ہے لیکن موجودہ دور کی سیاست جن مضامین پر مشتمل ہے اس کی وجہ سے ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اس کتاب کو پڑھنا ہی نہیں چاہتے۔مگر معاشرت،معیشت اور مذہب نے جس طرح قومی زندگی میں اپنی اہمیت ثابت کررکھی ہے اس کے بعد عملی سیاست سے صرفِ نظر کرنا گویا قومی اور ملکی دونوں محاذوں پر زندگی کے تینوں عناصر سے چشم پوشی کرنا ہے وہ بھی مجرمانہ حدتک۔

***

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پورا ملک ایک قوم کی صورت میں معاشی اور اخلاقی تنزل اور پستی بلکہ بربادی کے مسئلہ کو پہلی ترجیح بناتا۔ تعلیم وصحت اور رفاہِ عام کا کام مطلوب ہوتا۔ غریبی، مہنگائی اور بے روزگاری کے مسائل کا جائزہ ہوتا اور ملک کی نئی نسل کے لیے عزائم و اعمال کی مرتب فہرست تیار کی جاتی۔ ملک کی معیشت میں انسانیت کے سب سے بڑے گناہ سرمایہ داری کی لعنتوں یعنی سود، قمار اور شراب کے کاروبار سے جنگ کا اعلان ہوتا۔ سرمایہ داروں کی لوٹ کو ڈاکوؤں سے زیادہ خطرناک بتایا جاتا۔ یہ بھی ہوتا کہ ملک کی ہر علاقائی، تہذیبی، لسانی اور مذہبی اکائی کے تحفظ کو ملک وقوم کی سرخروئی کی ضمانت سمجھا جاتا۔ مگر یہ سب اب جیسے ''بسا آرزو'' کی خاک میں مل چکا ہے۔ ایسے میں اصل ذمہ داری ان کی ہے جو اکثریت کی فہرست میں مندرج ہیں۔ سروں کا گننا ہی اگر اصل ہے تو سروں کے دماغ کی صحت کی فکر بھی ہونی چاہیے، لیکن سب سے زیادہ اگر دل و دماغ کی صحت کی دعا جس قوم کے لیے ضروری ہے وہ اس ملک کی دوسری سب سے بڑی اقلیت ہے جو اسی امتیاز کے باعث اکثریت کے جبر کا نشانہ بھی ہے۔ دنیا کے کسی ملک میں شاید ہی کوئی ایسی اقلیت ہو جو اس ملک کی سیاست کا مرکز بن کر اکثریت کے اعصاب پر سوار کر دی گئی ہو۔ ملک کی آزادی کے بعد تقسیم ملک کے نتائج کی شکل میں مسائل ضرور پیدا ہوئے لیکن ادھر ایک دہائی میں آئین و دستور و انصاف کے مسلمہ اصولوں کی تقسیم بلکہ تنسیخ کے ارادوں کی صورت میں اقلیت کے لیے جو مصائب درپیش ہیں ان کو دیکھنے کے لیے اب کسی اور نظر کی ضرورت ہے۔ معارف کے شذرات کی سوسال کی تاریخ میں ہندوستانی مسلمانوں کے اتنے مسائل موجود نہیں جتنے ادھر کے زمانۂ قریب میں شمار کیے گئے۔ رمضان کے چاند کے ساتھ سی، اے، اے کے نفاذ کے اعلان کے پس پشت جو مکروفریب ہے اس سے قطع نظر یہ جمہوریت کی بنیاد کو کھوکھلا کر دینے کا عمل ہے۔ یہی کیا کم تھا کہ یوپی کے مدرسہ تعلیمی بورڈ ہی کو یہ کہہ کر ختم کر دیا گیا کہ یہ سیکولرزم کے اصولوں کے منافی اور الٹرا وائرس ہے، اس لیے غیر قانونی ہے۔ سیکولرزم کے اصول کی موجودہ حالات میں یہ دُہائی بھی طرفہ تماشا بن گئی۔ کبھی عربی فارسی بورڈ الہ آباد کے نام سے منشی، عالم، کامل، فاضل وغیرہ اسناد کے ذریعہ معاشرہ کے ایک طبقہ کو علم و تعلیم سے رشتہ استوار کرنے کی یہ روایت بہر حال با مقصد تھی، بالکل سنسکرت کی پاٹھ شالاؤں کی طرح۔ لیکن برق تو وہیں گرتی ہے جس کا شکوہ ایک زمانہ سے ہوتا آیا ہے یعنی اقلیت کا مذہب، اس کی قانونی اور تہذیبی و معاشرتی روایات، اس کی زبان، اس کی تعلیم جس کا

حق ملک کے دستور نے دیا۔اب اسی کے متوازی کسی اور دستور کا وہ حوالہ دیا جارہا ہے جو ابھی نقطہ موہوم سے زیادہ وجود نہیں رکھتا۔

***

چند دنوں بعد ہونے والے الیکشن کے تقاضے پہلے سے زیادہ ہیں جن کو پورا کرنا سب کے لیے ضروری ہے لیکن اس اقلیت کے لیے بدرجہ اتم فرض ہے جس نے کبھی جن کو لطف تکلم سے آشنا کیا تھا ،اب ان ہی کی گرم گفتاری اور بے کرداری کی زیادتی بھی جھیل رہی ہے۔ جاننا تو ضروری ہے کہ قصور کس کا ہے؟ ماضی کی باتوں میں الجھے رہنے اوران ہی کی بنیاد پر پرانے فیصلوں پر قائم رہنے کی یہ روش یوں بھی معتبر نہیں کہ فطرت کا ایک قول فیصل یہ بھی ہے کہ تِلۡكَ اُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ ج لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَلَكُمۡ مَّا كَسَبۡتُمۡ ج وَلَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ o

***

گذشتہ دنوں انگریزی کے مشہور صحافی اور ممبئی کے ٹائمز آف انڈیا کے ادارتی شعبہ کے اہم رکن ڈاکٹر وجیہ الدین نے خاص طور پر دار المصنّفین کے لیے اعظم گڑھ کا سفر کیا۔ وہ آئے اور شوق، محبت اور توجہ سے دار المصنّفین کے ذرہ ذرہ سے آشنا ہوئے۔اس کے مستقبل کے لیے خود بھی فکر مند ہوئے، دوسروں کو بھی اپنے ساتھ اس فکر میں شامل کرنے کے آرزومند ہوئے۔ ہر مسافر ایسا نہیں ہوتا۔اب انہوں نے ٹائمز کے ذریعہ دار المصنّفین کے تاریخی وعلمی امتیازات کو غیر اردوداں دنیا کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے۔اس محبت اور جذبے کے لیے شکر یہ یقیناً واجب ہے۔

***

یگانہ روزگار، فاضل محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدرآبادی فرنسوی مرحوم کی بھتیجی محترمہ کریمہ صبغۃ اللہ نے اسی سال ۳۱ جنوری کو وفات پائی۔ یہ خبر دیر سے ملی۔ مرحومہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے خاندان میں تنہا تھیں جنہوں نے اپنے عظیم المرتبت عم محترم کی یادوں کی شمعوں کو ہمیشہ روشن رکھا۔ان پر ایک کتاب بھی لکھی۔ان کے خطوط کا مجموعہ بھی شائع کیا۔معارف اور دیگر رسائل میں ان کی تحریریں اسی سلسلہ میں شائع ہوتی رہیں۔افسوس یہ شمع بھی اب گل ہوگئی۔۲۹ رشعبان المعظم کو معارف کے خاص اور دیرینہ کرم فرما جناب مولانا وارث ریاضی کی اہلیہ محترمہ طویل علالت کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوگئیں، عین عالم نزع میں کلمہ طیبہ ان کی زبان پر تھا۔اللہ تعالیٰ دونوں خواتین کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر و رضا کی توفیق دے۔

***

مقالات

ڈپٹی نذیر احمد کی ایک نایاب تصنیف
''اجتہاد'' (ایک جائزہ)

ڈاکٹر ماجد الاسلام
لکچرر، ڈگری کالج لارنو، اننت ناگ، کشمیر
abmajid456@gmail.com

ڈپٹی نذیر احمد موجودہ اتر پردیش کے ضلع بجنور میں ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام سعادت علی تھا، پہلے شکر سازی کا کام کرتے تھے،لیکن بعد میں معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔نذیر احمد نے چار سال کی عمر میں تعلیم کا آغاز گھر سے کیا، والد سے بغدادی قاعدہ اور ناظرہ پڑھا۔اس کے بعد ان کا داخلہ مکتب میں ہوا لیکن ان کے والد مطمئن نہ ہوئے تو والد ہی سے نو برس تک عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد مولوی نصراللہ خان کے پاس مزید تعلیم کے لئے بھیجا۔تین برسوں میں نذیر احمد نے نحو عربی شرح ملا تک اور منطق میں تہذیب، میر قطبی اور فلسفے میں میبذی تک پڑھا۔۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۵ء تک دہلی کے اورنگ آبادی مسجد میں تعلیم حاصل کی۔۱۸۴۵ء میں دہلی کالج میں ان کا داخلہ ہوا۔دہلی کالج میں عربی زبان وادب ان کا خاص میدان تھا۔دہلی کالج کا زمانہ ان کی زندگی کا اہم ترین دور تھا جس سے ان کی زندگی میں کئی اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔کالج کا زمانہ ۱۸۵۴ء تک رہا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد نذیر احمد وقتاً فوقتاً تحصیل دار اور ڈپٹی کلکٹر وغیرہ مختلف عہدوں پر مختلف جگہوں پر فائز ہوتے رہے۔۱۸۷۷ء میں انگریزی ملازمت ترک کر کے سالار جنگ کی پیشکش پر حیدر آباد چلے گئے۔حیدر آباد میں ان کا کام مختلف دفاتر کا معائنہ کرنا اور ان کی رپورٹ تیار کرنا تھا۔یہاں بھی انہوں نے مختلف ناظم بندوبست وغیرہ عہدوں پر کام کیا۔دوران ملازمت اور اس کے بعد بھی انہوں نے تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رکھا اور اس میدان میں خوب شہرت کمائی۔کئی ترجموں اور تصانیف پر ان کو حکومت وقت کی جانب سے انعامات اور اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ان کی تصانیف

کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جن میں تراجم، اصلاحی کتابیں (ناول)، درسی کتابیں اور مذہبی کتابیں شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مختلف موقعوں پر چوالیس لکچر بھی دیے جن کو بعد میں ان کے بیٹے بشیر الدین نے مرتب کیا ہے۔ ذیل میں ان کی تصانیف کے نام درج کئے جائیں گے۔

تراجم میں انکم ٹیکس ایکٹ، انڈین پینل کوڈ، مصائب غدر، ضابطہ فوجداری وغیرہ۔ ناول میں مراۃ العروس، بنات النعش، توبتہ النصوح وغیرہ۔ درسی کتابوں میں چند پند، نصاب خسرو، صرف صغیر وغیرہ۔ مذہبی تصانیف میں ترجمہ قرآن، اتمام حجت، اجتہاد وغیرہ جیسی کتابیں تصنیف کی ہیں۔

زیر نظر مضمون ان کی مشہور اور معرکہ آرا مذہبی تصنیف ''اجتہاد'' کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

کتاب کے سرورق پر مصنف کا نام ''شمس العلماء مولانا مولوی حافظ نذیر احمد'' درج ہے۔ تاریخ اشاعت ۱۳۲۵ھ تحریر کیا گیا ہے۔ ۱۵۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب میں فاضل مصنف نے کل سولہ عنوانات قائم کئے ہیں جو درج ذیل ہیں:

> اسلامی معتقدات، خداشناسی، توحید باری تعالیٰ، شرک، وجود باری تعالیٰ، دین اسلام کی سہولتیں، توحید اصل مذہب ہے، حسن و قبح کا احساس فطری ہے، رسالت، پیغمبر اسلام کی صداقت، معجزات اور پیشین گوئیاں، نزول قرآن کی اصلی غرض، اس زمانے کے مولویوں کو نیک صلاح، زہد، دیگر مذاہب اور اصول اسلام اور مسلمانوں کی اصلاح حالت۔ آخر میں مصنف نے دو ضمیمے شامل کئے ہیں۔ پہلے ضمیمہ میں ان بارہ اماموں کے مختصر حالات بیان کئے ہیں جو خلفائے راشدین کے بعد امام کے معزز لقب سے پکارے گئے۔ دوسرے ضمیمے میں عشرہ مبشرہ کے حالات زندگی اور دین اسلام میں ان کی خدمات کا تذکرہ کیا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے کتاب کی وجہ تصنیف کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ایک دن اکیلے بیٹھے تھے کہ یہ خیال آیا ''میں کیوں مسلمان ہوں''؟ اس حوالے سے ان کے دل میں مختلف سوالات ابھرے۔ ان ہی سوالات کے جوابات کو مختلف عنوانات کے تحت قلم بند کیا۔ ''اجتہاد'' اسی مجموعۂ سوالات و جوابات کا نام ہے۔ لہذا یہ کوئی فقہی تصنیف نہیں ہے۔ مصنف نے اس میں عقلی اور نقلی دلائل کی روشنی میں اسلام کو ایک فطری مذہب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک موروثی اور دوسرا اجتہادی مسلمان۔ ان کے نزدیک اجتہادی مسلمان وہ ہیں جو غور وفکر کے نتیجے میں مسلمان بن جائیں۔ غور وفکر کے نتیجے میں وہ حق کو ضرور دریافت کرے گا یعنی اسلام کا معتقد بن جائے گا۔ کتاب کے متعلق بعض اہل علم کی رائیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ افتخار عالم بلگرامی: ''اجتہاد'' سے خالص اسلامی اصول کو دلائل عقلی اور شواہد مسلمہ سے ثابت کیا ہے۔ یہ علم کلام میں بڑے پائے کی کتاب ہے۔ اسلام کی تائید میں ایسے تشفی بخش اور یقین دلانے والے اسرار بیان کیے گئے ہیں کہ نوجوان انگریزی خواں کو سائنس اور مذہب کی کشمکش میں ثابت قدم نہیں رہ سکتے وہ اس کو دیکھ کر بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ لا مذہب الا الاسلام۔ [۱]

۲۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: اس کتاب کا موضوع تو مذہبی حقائق کی تشریح اور عقائد کی اصلاح ہے...... یہ کتاب مذہبی حقائق کے بارے میں مصنف کے مجتہدانہ غور و فکر کی مکمل روداد ہے۔ [۲]

۳۔ پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی: کتاب کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فقہ یا اجتہاد فقہی کے موضوع پر ہے لیکن کتاب کا مواد بالکل جداگانہ ہے۔ اس کے بیشتر مباحث ترجمۃ القرآن، الحقوق والفرائض اور مطالب القرآن میں مشترک ہیں۔ خاص کر عقیدہ توحید، اسماء الٰہی، شرک وغیرہ۔ [۳]

۴۔ ظفر الاسلام اصلاحی: اس کتاب کی اہمیت اس سے بھی بخوبی واضح ہوتی ہے کہ اس کے مباحث کو نقلی و عقلی دونوں قسم کے دلائل سے مستحکم کیا گیا ہے۔ اگرچہ اصل مقصد تصنیف کو پیش نظر رکھتے ہوئے مصنف نے عقلی استدلال پر خاص زور دیا ہے لیکن جابجا انہوں نے قرآن کریم، حدیث اور تاریخ اسلام سے استشہاد کیا ہے۔ خاص طور سے جس کثرت سے انہوں نے قرآنی آیات کے حوالے پیش کیے ہیں وہ واضح طور پر قرآن کریم سے ان کے گہرے تعلق کی تصدیق کرتے ہیں۔ [۴]

پہلا عنوان ''اسلامی معتقدات'' ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ ایک شخص کو مسلمان بننے کے لئے اللہ کے احکامات کا زبان سے اقرار کرنا اور دل سے ان کو سچا جاننا ضروری ہے۔ صرف زبان سے کلمہ پڑھنا مسلمان ہونے کے لئے کافی نہیں ہے۔ قرآن نے ان لوگوں کی نشاندہی کی ہے جن کی زبان پر ایمان کا اقرار اور دل اس چیز سے خالی ہیں۔ قرآن کی رو سے وہ لوگ ایمان سے خالی ہیں اور انھیں اس بات کا شعور نہیں ہے کہ وہ کس چیز سے محروم ہیں۔ وہ مسلمانوں کا دھیان اس طرف دلاتے ہیں کہ وہ ایک

۱۔ افتخار عالم بلگرامی، حیات النذیر، شمسی پریس، دہلی ۱۹۲۶ء، ص: ۴۲۶

۲۔ افتخار احمد صدیقی، مولوی نذیر احمد۔ احوال و آثار، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۲۹۲

۳۔ پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، شمس العلماء نذیر احمد اور علوم اسلامیہ، (فکر و نظر خصوصی شمارہ ڈپٹی نذیر احمد) ۱۹۹۴ء، ص ۱۰۰

۴۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، ڈپٹی نذیر احمد کی اہم تصنیف اجتہاد کا تجزیاتی مطالعہ، (فکر و نظر خصوصی شمارہ ڈپٹی نذیر احمد) ۱۹۹۴ء، ص ۱۱۵

دوسرے کو برداشت کریں۔ معمولی باتوں کو لے کر کسی مسلمان پر کافر ہونے کا فتویٰ صادر نہ کریں کیوں کہ اسلام کی رو سے کسی مسلمان کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی کو اسلام سے خارج کرے۔ حضورؐ نے ساری زندگی اسی چیز پر محنت کی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ مشرف بہ اسلام ہو جائیں مگر افسوس اس بات کا ہے کہ آج کے مسلمان ایک دوسرے کو کافر یا خارج از اسلام کرنے کے حوالے سے حیلے تلاش کر رہے ہیں۔ وہ لوگوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ مقلد مسلمان کے بجائے مجتہد مسلمان بن جائیں۔ وہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے اور مسلمانوں جیسا نام رکھنے کو وہ کافی نہ سمجھیں اور نہ مذہب کو ایک رسم سمجھیں۔ وہ مذہب کو زندگی کی ضرورتوں میں اہم ضرورت تسلیم کریں۔ ہر ایک چیز کو گہرائی سے دیکھے اور غور و فکر کرے کہ کس نے بنائی، کس غرض سے بنائی وغیرہ۔ فطرت پر غور و فکر کو وہ مسلمان ہونے کی بنیاد سمجھتے ہیں۔

''خدا شناسی'' کے تحت ذات باری تعالیٰ کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسلام کی سب سے اولین شرط یہ ہے کہ صمیم قلب سے خدا کی ذات کو تسلیم کیا جائے۔ اللہ کو ابدی اور آسمان و زمین کا خالق مانا جائے۔ ان کے مطابق دنیا کے اکثر مسلمان تقلیدی مسلمان ہیں یعنی ان کے آباء و اجداد مسلمان تھے تو یہ بھی مسلمان ہوئے۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ تقلیدی مسلمانوں نے مذہب کو قومیت بنا کے رکھ دیا ہے جس کے نتیجے میں اختلافات نے جنم لیا۔ اگر موروثی مسلمان اجتہادی مسلمان بن جائیں تو امت میں اختلافات اگر ختم نہیں ہوں گے تو کم ضرور ہوں گے۔ ڈپٹی نذیر احمد ان لوگوں کو جانوروں سے تشبیہ دیتے ہیں جو اس وسیع کائنات پر غور نہیں کرتے۔ کائنات پر غور کرنا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ انسان کا موازنہ جانوروں سے کرتے ہوئے ڈپٹی نذیر احمد یوں رقم طراز ہیں:

آدمی قلیل العلم اور جہول ہونے پر بھی علم کے اعتبار سے جانوروں پر فضیلت رکھتا ہے۔ [اور البتہ ہم نے بنی آدم کو عزت دی اور خشکی اور تری میں ان کو (جانوروں اور کشتیوں پر) سوار کیا اور عمدہ (عمدہ) چیزیں انھیں (کھانے کو) دیں اور جتنی مخلوقات ہم نے پیدا کی ان میں سے بہتیروں پر ان کو برتری دی] (بنی اسرائیل: ۷۰)۔

ان کا کہنا ہے کہ جانوروں کا علم وہبی ہے اور آدمی کا وہبی اور اکتسابی دونوں۔ یہی وجہ ہے کہ جانوروں کا علم ترقی پذیر نہیں ہے جب کہ آدمی کے علم کی ترقی کی کوئی حد نہیں۔ دوسری بات یہ کہ علمی شرافت ایک امر اضافی ہے۔ آدمی شرافت رکھتا ہے جانوروں کے مقابلے میں۔ مگر کتنی ہی ترقی کیوں نہ

کرے، خدا کے مقابلے میں جہول ہی رہے گا۔[5]

ان کے مطابق انسان کو عقل اس لئے دی گئی کہ وہ ایک حد تک غور وفکر کرے اور یہی غور وفکر اس کو خدا شناسی کی طرف رہنمائی کرے گا۔لیکن خدا کی ذات کے بجائے انسان اس کی بنائی ہوئی کائنات میں غور کرے اور وہی چیز انسان کو خدا کی ذات سے شناسائی عطا کرے گی۔خدا کی ذات انسان کے عقل میں نہیں آسکتی کیوں کہ عقل انسانی ایک حد پر جا کر رک جاتی ہے۔یہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔لہٰذا خدا کی ذات کو دنیا کے بادشاہوں پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

خدا کی حقیقت دریافت کرنے سے عاجز رہنا ہی ایک طرح کی دریافت کرنا ہے۔[6]

''توحید'' کو موضوع بحث بناتے ہوئے ڈپٹی نذیر احمد نے یہ واضح کیا کہ جس طرح مخلوقات پر غور و فکر کرنے سے انھیں خالق کی معرفت نصیب ہوئی، اسی طرح دنیا کے نظام پر غور وفکر سے مجھے یہ بات آشکارا ہوئی کہ اس کا بنانے والا اور ترتیب دینے والا اکیلا اور تنہا ہے کیوں کہ اگر وہ ایک سے زیادہ ہوتے تو اس میں بہت اختلاف ہوتا۔دنیا کا نظام کسی نظم کا پابند نہ ہوتا۔اس حوالے انہوں نے قرآن کی آیات کو بھی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔

اگر (زمین میں وآسمان میں خدا کی سوا اور معبود ہوتے تو زمین وآسمان دونوں کبھی کے) برباد ہو گئے ہوتے۔

وہ عقیدہ توحید کو اسلام کی سب سے بڑی خوبی بتا کر اس کو اسلام کی صداقت کی پہچان قرار دیتے ہیں۔ اسی عقیدہ کی وجہ سے اسلام کو دنیا کے دوسرے ادیان پر فوقیت حاصل ہے۔توحید انسان کی فطرت میں شامل ہے۔لہٰذا اس سے انکار ممکن نہیں ہے۔وہ فطرت کی تعریف یہاں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

فطرت کے یہ معنی ہیں کہ انسان کو خدا کا خیال کرنے کے مواقع اکثر پیش آتے رہتے ہیں اور جب ایسا موقع پیش آتا رہتا ہے وہ چار و ناچار خدا کا خیال کرتا ہے جیسے کہ بالا رادہ انسان کے خواص فطری میں ہے۔مگر ضروری نہیں کہ آدمی ہمہ وقت حرکت کرتا رہے۔رہا خدا کا انکار میں تو کہے جاؤں گا کہ آدمی ناسمجھی سے خدا کے مصداق میں غلطی کرسکتا ہے۔خدا کا انکار نہیں کرسکتا اور جن کو تم منکر سمجھتے ہو جیسے دہریئے۔[7]

۵۔اجتہاد، افضل المطابع، دہلی، ۱۳۲۵ھ، ص ۱۱

۶۔ماخذ سابق، ص ۱۳

۷۔ ماخذ سابق، ص ۲۴

توحید کے فوراً بعد ’’شرک‘‘ کو موضوع بحث بنایا ہے۔اور شروع میں ہی یہ سوال قائم کیا ہے کہ توحید کی تعلیم فطرت کی آواز ہے اور اس کی یاددہانی کے لئے اللہ تعالیٰ نے وقتاً فوقتاً انبیاء بھیجے تو پھر اولاد آدم میں شرک اور بت پرستی کیوں رواج پا گئی۔اس کے جواب میں رقم طراز ہیں:

> رواج پایا آدمی کے مرئی اور مشاہد اسباب کے خوگر ہونے سے۔وہ بالطبع خدا کے بارے میں دعاوی اوقلیدس کا سا ثبوت چاہتا ہے اور اسی سے اس کی تسکین ہوتی ہے۔پس وہ خدا کے بارے میں بھی اپنی من سمجھوتی کے لئے بے بنیاد باتیں بناتا اور ان کی لغو اور بے ہودہ اور سخیف تاویلیں کرتا ہے۔یہ ہے اصل شرک اور بت پرستی کی۔[8]

انھوں نے شرک کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے:

> خدا کی خدائی میں کسی کو (ہر کسے باشد یا ہر چہ باشد) ساجھی ماننے کو مذہبی اصلاح میں شرک کہتے ہیں۔[9]

انھوں نے شرک کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔خدا کی ذات میں، خدا کی صفات میں اور خدا کی عبادت میں۔خدا کی ذات میں شرک یہ ہے کہ کئی خدا تسلیم کئے جائیں۔شرک فی الصفات یہ ہے کہ ’’اللہ کی قدرت، علم، اختیار یا اس کی کسی صفت میں، کسی دوسرے کو شریک تسلیم کیا جائے‘‘ اور شرک فی العبادت یہ ہے کہ ادب و تعظیم کے وہ طریقے جو خدا کے ساتھ خاص ہیں جیسے دعا، نذرونیاز، منت، قربانی وغیرہ دوسروں کے لئے عمل میں لائیں جائیں ۔ساتھ ہی انھوں نے شرک کی دو اور قسمیں شرک جلی اور شرک خفی بھی بیان کی ہیں۔

’’وجود باری‘‘ کے عنوان کے تحت اللہ کی ذات کو بڑی خوبصورتی سے سمجھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ کی معرفت ہی اصل مذہب ہے۔انسان فطرۃً ایک مذہبی مخلوق ہے۔دنیا میں پیدا ہوتے ہی انسان پر یہ بات کھل جاتی ہے کہ دنیا عالم اسباب ہے۔ہر ایک وقوع کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہے۔جیسے بارش بادل کی وجہ سے برستی ہے اور بادل بخارات سے بنتے ہیں اور بخارات کا سبب آفتاب کی گرمی اور یہ اسباب مسبب الاسباب پر ختم ہوجاتے ہیں جس کا کوئی سبب نہیں اور وہ اللہ کی ذات ہے۔جس کو کوئی اللہ، کوئی بھگوان یا کوئی گاڈ کہتا ہے۔انسان ایک ناقص مخلوق ہے جس کے ذرائع علم محدود ہیں۔ساتھ

۸۔ ماخذ سابق، ص ۲۴

۹۔ ماخذ سابق، ص ۲۹

ہی ساتھ اس کے پاس عقل بھی ہے جس کی مدد سے وہ عقل میں نہ آنے والی چیزوں کو بھی سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کرتا ہے جن میں خدا کی ذات بھی شامل ہے۔ عقل کے ناقص استعمال سے وہ قدم قدم پر بھٹکتا پھرتا ہے، ٹھوکریں کھاتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

''دین اسلام کی سہولتیں اور ادیان کی تکلیفیں'' کے عنوان کے تحت اسلام کا موازنہ دوسرے مذہبوں سے کرتے ہوئے ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں کہ روحانی اور جسمانی دو طرح کی تکلیفیں ہوتی ہیں۔ انسان میں اگر خلوص ہو اور خلوص کی بنیاد پر عبادات انجام دیں تو عبادت اس کے لئے روحانی اعتبار سے آرام و مسرت کا باعث بن سکتی ہے۔ تاریخ اسلام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ماضی میں اسی خلوص کی بنیاد پر روحانی سکون حاصل کرنے کے لئے مرد کیا عورتوں نے بھی جلتی آگ میں کودنا پسند کیا۔ نہ صرف یہ کہ بلکہ مجاہدین اسلام نے اللہ کی راہ میں اپنی گردنیں بھی کٹوائیں۔ ان کے مطابق اسلام کا ہر حکم فطرت کے مطابق ہے اور جو حکم فطرت کے مطابق ہو اس پر عمل کرنا آسان ہوتا ہے۔ آسانی اور فطرت کا آپس میں گہرا رشتہ ہے اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اسلام کے برخلاف عیسائی اور ہندو مذہب میں بہت سارے کام خلاف فطرت ہیں، جنھوں نے مجھے مسلمان بننے پر مجبور کیا۔ دونوں مذاہب کے لوگ خلاف فطرت احکام کے باوجود کوئی گلہ شکوہ نہیں کرتے ہیں۔ اس لئے کہ قرآن کا فرمان ہے:

كُلُّ حِزْبٍ م بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (الروم۔۳۰:۳۲)

جو (دین) جس فرقے کے پاس ہے (وہ) اسی سے خوش ہیں۔ اور

يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعاً (الکهف۔۱۸:۱۰۴)

وہ (اپنی غلط فہمی سے) اسی خیال میں ہیں کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔

''حسن و قبح کا احساس فطری ہے'' کو موضوع بحث بناتے ہوئے وہ نیک و بد کے شعور کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ انسان کو جس چیز سے تکلیف پہنچتی ہے۔، اس کو فطری اعتبار سے وہ اپنے حق میں بھی اور دوسروں کی خاطر بھی برا سمجھتا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے فطرۃً ایک دوسرے کا ہمدرد بنا کر پیدا کیا ہے۔ وہ سوال کھڑا کرتے ہیں کہ ایک طرف انسان ایک دوسرے کا ہمدرد ہے تو دوسری طرف یہی انسان زمین میں فساد کیوں پھیلا رہا ہے۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں انسان اگرچہ اشرف المخلوقات

ہیں لیکن اکبر المخلوقات نہیں۔ کائنات میں انسان کے سوا جتنی بھی مخلوقات ہیں وہ تکوینی اعتبار سے احکام الٰہی کی پابند ہیں جب کہ انسان کا معاملہ اس کے برعکس ہے کہ وہ دنیا کے حکمرانوں سے سرتابی کرنے سے گریز کرتا ہے لیکن حقیقی حاکم یعنی خدائے واحد کے حکم سے گریز نہیں کرتا ہے۔ وہ دنیا کے حکمرانوں کے قانون اور حاکم حقیقی کے قانون کے فرق کو اس طرح واضح کرتے ہیں:

حاکم وقت کا قانون نقل ہے قانون الٰہی کی اور نقل بھی ہے تو ناقص و ناتمام۔ کجا حاکم وقت اور کجا خدائے تعالیٰ۔ حاکم وقت کیسا ہی بیدار مغز اور با اقتدار ہو پھر بھی بندۂ بشر ہے، مرکب من الخطا والنسیان اور اس کا اختیار بھی محدود ہے۔ اِنَّمَا تَقۡضِیۡ هٰذِهِ الۡحَیٰوةَ الدُّنۡیَا کیا آدمی، کیا اس کا قانون کیا پدی کیا پدی کا شوربا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جرموں کا وقوع اس طرح پر ہوتا ہے کہ مجرم پہلے جرم کا ارادہ کرتا ہے، پھر جس فعل کا ارادہ کرتا ہے اس کو کر گزرتا ہے تو ارادے تک حاکم دنیا اس کا کچھ نہیں کرسکتا اس لئے کہ اس کو لوگوں کے دلی ارادے کا علم نہیں ہوسکتا۔ ہاں وقوع جرم کے بعد وہ اختیار رکھتا ہے کہ مجرم کو سزا دے۔ غرض جرم کا ارادہ قانون دنیا کی رو سے جرم نہیں لیکن قانون الٰہی میں جرم کا ارادہ کرنا بھی جرم ہے "وان تبدوا ما فیٓ انفسکم او تخفوہ یحاسبکم به الله (البقرہ۔۲:۲۸۴) اور ظاہر ہے کہ ارادہ اصل ہے اور فعل اس کی فرع نتیجہ کیا نکلا کہ قانون الٰہی جرموں کو جڑ سے اکھاڑتا ہے اور حاکم وقت کا قانون جرموں کی جڑ پر تو دسترس نہیں رکھتا۔ ٹہنیوں اور پتوں کو کاٹتا چھانٹتا رہتا ہے، بدی کی جڑ بدستور قائم ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو قانون الٰہی باطن اور ظاہر دونوں کی اصلاح کرتا ہے اور حاکم وقت کا قانون فقط ظاہر کی۔ حکام وقت کے قانون میں اس کے سوا ایک نقص اور ہے کہ اس قانون میں ثبوت جرم کا مدار شہادت پر ہے اور شہادت نہ ہو یا ہو اور کافی نہ ہو تو مجرم سزا سے بچ جاتا ہے اور ایسی صورتیں ہر حاکم کے اجلاس میں روز پیش آتی رہتی ہیں۔ بخلاف اس کے قانون الٰہی کا مجرم سزا سے بچ ہی نہیں سکتا۔ نفس لوامہ کا مجسٹریٹ مجرم کے دل میں بیٹھا ہوا اس کو ندامت اور ملامت اور حسرت اور افسوس کی سزا دے رہا ہے جس کی سزا قید اور جرمانے اور تازیانے سے بڑھ کر ہے۔۱۰

نذیر احمد مذہب کو ایک عمارت سے تشبیہ دیتے ہیں کہ یہ عمارت سات چیزوں سے مل کر تعمیر ہوتی ہے جس میں معرفت الٰہی، عبادت، رضا جوئی ، ہمدردی، احساس حسن وقبیح افعال، جزا وسزا اور عاقبت

۱۰۔ ماخذ سابق، ص ۴۲

شامل ہے۔اس مذہب کی عمارت کو درست رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مختلف اوقات میں پیغمبر بھیجے۔رسالت پر بات کرتے ہوئے ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں کہ ابتدائے انسانیت سے ہی مذہب اور فطرت ساتھ ساتھ تھی اور شروع سے ہی پیغمبروں نے فطرت کی تائید میں کام کیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ڈپٹی صاحب الٰہی دین اور انسان کے گھڑے ہوئے دین کو ایک ہی ترازو میں تولتے ہیں جو کسی بھی حال میں درست نہیں ہے۔کہتے ہیں کہ دونوں میں صداقت موجود ہے۔اگر کسی آدمی نے کسی دین کی بنیاد رکھی تو وہ بھی انسانوں کے فائدے کے لئے ہی بنایا ہے۔شروع میں سب ادیان معقول تھے لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے ماننے والوں میں نا معقولیت آتی گئی۔پھر وہ اسلام کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کے ماننے والوں کے اعتقادات میں اتنا ردوبدل آ گیا جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔پیغمبروں کے مبعوث ہونے کا مقصد یہ تھا کہ انسانوں کو مذہب کے تقاضوں یا اللہ کی مرضی سے آشنا کیا جائے۔وہ ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جو کام اللہ کو پیغمبروں سے لینا تھا، وہ فطرت سے بھی لے سکتا تھا، پھر کیا وجہ ہے کہ پیغمبروں کا سلسلہ جاری ہوا۔اس کی وضاحت میں وہ لکھتے ہیں کہ انسان اس حوالے سے غور کرے تو اس کا یقین حق الیقین میں بدل جائے گا۔پیغمبروں اور عام انسانوں کے درمیان فرق کی وضاحت مصنف نے یہ کی ہے کہ جنسیت کے اعتبار سے دونوں یکساں ہیں لیکن نوعیت کے اعتبار سے دونوں مختلف ہیں اور اس کا سب سے بڑا مظہر پیغمبروں پر وحی کا نزول ہے۔وہ اس کی مزید تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> جنسیت کے اعتبار سے تو ہماری اور پیغمبروں کی فطرت یکساں ہیں قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ مگر نوعیت کے اعتبار سے مختلف۔یُوْحٰی اِلَیَّ اَنَّمَا اِلٰهُکُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (الکہف۔۱۸:۱۱۰) قواعد فطری سب آدمیوں میں بلا استثنائی احد یکساں ہیں۔مگر افراط تفریط اور اعتدال قویٰ کی رو سے لوگوں کے مدارج متفاوت ہیں۔ہم دیکھتے ہیں کہ مبدأ فیاض نے حافظہ سب آدمیوں کے سروں میں رکھا ہے مگر کسی کا حافظہ قوی ہے، کسی کا ضعیف، کسی کا درجہ متوسط اور اسی پر دوسرے قوی کو قیاس کرلو۔اس کو ایک مثال سے خوب سمجھوگے۔''وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّ نَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُ کُلِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ

لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (الرعد۔۱۳:۴)

(ترجمہ: اور زمین میں پاس پاس کئی قطعے ہوتے ہیں اور انگور کے باغ اور کھیتی اور کھجور کے درخت جن میں بعض دوشاخے ہوتے ہیں اور بعض دوشاخے نہیں ہوتے حالاں کہ سب کو ایک ہی پانی دیا جاتا ہے اور پھر بھی ہم بعض کو بعض پر پھلوں میں برتری دیتے ہیں۔ بے شک جو لوگ عقل کو کام میں لاتے ہیں ان کے لئے ان باتوں میں قدرت خدا کی بہت ہی نشانیاں موجود ہیں)۔[۱۱]

''پیغمبر اسلام کی صداقت'' کے عنوان کے تحت انہوں نے پیغمبروں کی شناخت کا ذریعہ بتانے کی کوشش کی۔ انہوں نے رسول اکرمؐ کی صداقت کی پہچان کے حوالے سے فطرت کو رہنما قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ حق گوئی اور راستی انسانی فطرت ہے۔ اگر کسی انسان کے اندر اخلاقی گراوٹ اور خرابیاں موجود ہوں اور اس صورت میں فطرت انسانی کو کسوٹی بنایا جائے تو سب عیاں ہو جائے گا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے رسول اکرمؐ کی صداقت کو کس طرح فطرت کی کسوٹی پر پہچانا۔ اس حوالے سے انہوں نے ایک طویل بحث کی ہے اور آخر میں اس بحث کو ان الفاظ میں سمیٹ لیا ہے:

غرض آدمی کے اعضاء اور افعال میں باہمی تناسب اور تعلق ہے۔ میں نے جناب رسول خداؐ کو قیافے اور تناسب افعال دونوں پہلوؤں سے جانچا اور تحقیقات کے بعد مجھ کو کامل اطمینان ہو گیا کہ اس قیافے اور ان اخلاق و عادات کا آدمی محال عقل ہے کہ نبوت کا غلط دعویٰ کرے اور خدا پر جھوٹ بولے جس کی عظمت اور جس کا جلال ہمہ وقت اس کے پیش نظر رہے اور وہ کسی حالت میں یاد خدا سے غافل نہ رہے یہاں تک کہ ساری عمر کھل کر نہ ہنسے۔ اکثر اوقات خائفانہ آسمان کی طرف دیکھا کرے شدائد جاں کنی میں اللھم الرفیق الاعلی کے سوا کوئی بات اس کے منہ سے نہ نکلے۔ اس پر خدا کا خوف اس قدر غالب ہو کہ راتوں کو نماز میں کھڑے کھڑے اس کے پاؤں سوج جائیں یہاں تک کہ خدا اس کی حالت پر ترس کھا کر خود مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤی (طٰہٰ۔۲:۲۰) اور لِیَغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (الفتح۔۲:۴۸) فرمائے اور وہ افلا اکون عبداشکورا کہہ کر عبادت سے باز نہ آئے۔[۱۲]

اسی طرح انھوں نے ایک اور سوال یہ کھڑا کیا کہ حضور کو دیکھے بغیر وہ کیسے آپؐ کی صداقت کے

۱۱۔ ماخذ سابق، ص ۶۰

۱۲۔ ماخذ سابق، ص ۵۳

قائل ہوئے۔اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شمائل نبویؐ کی کتابوں میں آپؐ کا جو حلیہ بتایا گیا ہے یا دوسرے ذرائع سے انھوں نے جو کچھ سنا ہے، اس چیز کو جب انھوں نے قیافے کی کتابوں سے ملایا تو ان پر یہ بات وہاں بھی آشکارا ہوئی کہ حضورؐ ''سراپا محسن اخلاق پر دلالت کرتا ہے''۔اسی طرح حضورؐ کی صداقت کو لے کر انہوں نے ایک اور مثال بھی پیش کی جس میں وہ لکھتے ہیں:

پیغمبر صاحبؐ معتدل اور سلیم الفطرۃ کے فرد اکمل تھے اور ان میں فطرت سلیم کا ملکہ ایسا راسخ تھا کہ وہ اس کے خلاف نہیں کر سکتے تھے اور اسی کو ہم پیغمبر کہتے ہیں۔خیر اور اخلاق کو تو رہنے دو صرف صدق کو لو جس کی اس وقت بحث ہے تو کلیہ قاعدہ ہے کہ آدمی کے تمام افعال معلل بالاغراض ہوتے ہیں یعنی آدمی کے ہر ایک فعل کا محرک اور سبب کوئی نہ کوئی مطلب ہوتا ہے اور وہ مطلب دو قسم سے خالی نہیں لالچ یا خوف۔سو لالچ اور خوف دونوں کئی کئی طرح کے ہیں۔لالچ ہے دولت کا، لالچ ہے سلطنت اور لوازم سلطنت یعنی حکومت اور برتری اور ترفع اور تفضّل کا۔لالچ ہے انتقام کا، علیٰ ہذا القیاس خوف بھی طرح طرح کے ہو سکتے ہیں۔منفع حاصلہ کے فوت ہو جانے کا خوف، بدنامی کا خوف یا مجمل طور پر کہنا چاہو تو لالچ ہے فائدے کا اور خوف ہے نقصان کا۔چوں کہ ہر ایک آدمی کے خاص اغراض ہوتے ہیں۔ہم فائدے اور نقصان کی صورتوں اور قسموں کو محصور نہیں کر سکتے لیکن جہاں تک پیغمبرؐ صاحب کی اغراض پر ہماری نظر احاطہ کر سکتی ہے ان کا لالچ اور خوف اگر ہوتا تو ان ہی صورتوں میں سے کسی صورت میں ہوتا جو میں نے گنوائیں۔لیکن ان کے حالات پکارے کہہ رہے ہیں کہ اگر بالفرض انہوں نے جھوٹ موٹ نبوت کا دعویٰ کیا تو کوئی محرک ان کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔پس اذافات الشرط فات المشروط کی رو سے جھوٹ دعوائے نبوت کرنا غلط یعنی صداقت ثابت۔[۱۳]

اس دلیل کی مضبوطی کے لئے انہوں نے تاریخ اسلام سے کئی واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔معجزات اور پیشین گوئیوں کے ضمن میں انھوں نے اس بات کی طرف توجہ دلائی۔انہوں نے رسول اکرمؐ کی ذات کو معجزے سے نہیں بلکہ فطرت سے پہچانا کیوں کہ ان کے مطابق وہ مذہب کی ہر بات کو فطرت سے جانچنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسلام کی سب سے بڑی صفت یہی ہے کہ وہ دین فطری ہے۔وہ معجزے کا بھی انکار نہیں کرتے اس لئے کہ ان کے مطابق اللہ فطرت سے ہٹ کر کسی بھی عمل کا

۱۳۔ ماخذ سابق، ص۴۳

ظہور لاسکتا ہے۔ اسلام کو عین فطرت جب کہ معجزے کو خلاف فطرت قرار دیتے ہیں۔ یہ دونوں مخالف چیزیں ہیں۔ لوگ خلاف فطرت سے خدا کے قائل ہوتے ہیں جب کہ وہ خود فطرت سے خدا کے قائل ہوئے ہیں اور اسی فطرت نے اس سے اطمینان کے درجہ تک پہنچایا ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے پانی کی مثال دی ہے کہ یہ مشیت الٰہی پر منحصر ہے چاہے پانی سے جلانے کا کام لے یا بجھانے کا۔

معاشرہ کی اصلاح کے لئے علماء کی ذمہ داریوں اور خود علماء کی اصلاح کی ضرورت کے اظہار کے ساتھ انہوں نے عام مسلمانوں کو ''نزول قرآن کی اصلی غرض'' کے تحت قرآن فہمی کی طرف توجہ دلائی کہ قرآن رٹنے اور تلاوت سے زیادہ سمجھنے کی ضرورت ہے تا کہ اس کے احکام پر عمل کیا جا سکے۔ خدا کی پسند و ناپسند معلوم ہو جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ خدا لوگوں کے خیالات کی اصلاح چاہتا ہے جس کے نتیجے میں ان کے معاملات درست ہو جائیں گے۔ معاملات کے درست ہو جانے کے نتیجے میں امن و امان قائم ہوگا۔ اس کے فوراً بعد انہوں نے ''اس زمانے کے مولویوں کو نیک صلاح'' کا عنوان قائم کیا ہے۔ اس کے تحت انہوں نے ان سے شکوہ بھی کیا ہے اور ان کے کارناموں کا اعتراف بھی کیا ہے۔ شکوہ اس چیز کا کہ قرآن فہمی کے حوالے سے اگر اس وقت کمی دیکھنے کو مل رہی ہے تو اس کے ذمہ دار یہی لوگ ہیں کیوں کہ یہ لوگ اس طرف توجہ نہیں دلاتے اور اعتراف اس چیز کا کہ عوام میں جو نماز روزے کے چرچے ہیں، وہ ان ہی کی بدولت ہیں۔ وہ اس چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ہر ایک انسان کو راعی یعنی نگراں بنایا گیا ہے اور ہر ایک کو اپنی رعیت یعنی نگرانی و نگہبانی کے لئے پوچھا جائے گا۔ جہاں تک مولویوں کا تعلق ہے انہوں نے اَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهِیُ عَنِ الْمُنْكَرِ کا جو اہم کام اپنے سر لیا ہے، اس میں وہ کوتاہی اور لاپروائی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ مذہب کو ایک درخت قرار دیتے ہیں اور دنیا میں امن و امان قائم کرنا اس کا پھل۔ وہ قاری سے سوال کرتے ہیں کہ آیا درخت مقصود بالذات ہے یا پھل؟ اس سے وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مولوی حضرات مذہب کے صرف ایک ہی پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں جب کہ دوسرا پہلو ان کی نگاہوں سے اوجھل رہ جاتا ہے۔ عبادات کو ہی سارا دین سمجھتے ہیں جب کہ معاملات کی طرف لاپروائی برتتے ہیں جس کے نتیجے میں سماج میں انتشاری کیفیت برقرار رہ جاتی ہے۔ اسی بات کی وضاحت وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

اگر تم نے درخت اور ثمر کی مثال کو تسلیم کر لیا ہے تو اب میری رائے سے ضرور اتفاق کرو گے مگر اسی

کے شمول میں ایک بات اور سمجھنے کی ہے کہ مذہب تو ایک مجموعہ مسائل کا نام ہے۔ پس مذہب کو میں دو طرح پر تقسیم کرتا ہوں۔ ایک تقسیم تو یہ ہے کہ مذہب میں تین قسم کے مسائل ہیں۔ معتقدات، عبادات، معاملات۔ دوسری تقسیم اس سے بھی مختصر ہے کہ مذہب میں صرف دو قسم کی باتیں ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ دو طرح کی تقسیم سے اصل مطلب میں کوئی فرق نہیں آتا۔ پس درخت اور ثمر کی مثال کی رو سے معتقدات اور عبادات یا حقوق اللہ کو درخت سمجھنا چاہیے اور معاملات یا حقوق العباد کو ثمر۔ اب مولویوں نے الٹا کر دیا کہ درخت کو ثمر بنا دیا اور ثمر کو درخت کیوں کہ ان کی تعلیم کا سارا زور معتقدات اور عبادات یعنی حقوق اللہ پر ہے۔ اور ثمر یعنی معاملات اور حقوق العباد سے ان کو بحث نہیں۔ گویا مذہب ایک درخت بے ثمر ہے۔ بس مولویوں سے مجھ کو اتنی ہی شکایت ہے اور نہ صرف اپنے مولویوں سے بلکہ ہندوؤں کے برہمنوں اور پنڈتوں سے، عیسائیوں کے پادری سے، یہود کے احبار اور ربیوں سے۔ جہاں دیکھو خدا کی روئی تو ایسی دھنکی جارہی ہے کہ خدا ہی پناہ دے اور معاملات یا حقوق العباد کا نام نہ تو تعلیمی کتاب میں ہے اور نہ تعلیم سینہ بسینہ یعنی مواعظ میں مگر برائے نام۔ عوام نے کہ وہی مسلمانوں میں عنصر غالب ہیں۔ اور مذہب کی بات بات میں مولویوں کا منہ تکا کرتے ہیں دیکھا کہ مولوی معاملات یا حقوق العباد کا تذکرہ تک نہیں کرتے ''تانت باجی راگ پایا''۔ سمجھ لیا کہ معاملات یا حقوق العباد سے مذہب کو کچھ تعلق نہیں ہوتا تو رفع یدین اور آمین بالجہر اور قراءۃ الفاتحہ خلف الامام اور الصاق الساق عند القیام اور وضع الیدین فی الصلوۃ علی الصدر اور دوالین اور ذوالین اور اسی طرح کی سیکڑوں باتوں کو مولوی ایسا مہتم بالشان سمجھتے ہیں کہ نماز جمعہ کے بعد سے جو وعظ فرمانا شروع کرتے ہیں تو ان ہی باتوں کے دھن میں عصر کا وقت تنگ ہو جاتا ہے۔[۱۴]

وہ مولوی سے شکوہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے فرار اختیار کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کے معاملات کی اصلاح کو اپنا فرض منصبی سمجھنے کے لئے تیار ہی نہیں ہے۔ وہ انہیں مشورہ دیتے ہیں کہ سب سے پہلے وہ مولوی حضرات اپنے آپ کا احتساب کریں اور یہ بات ذہن نشین کریں کہ وہ بھی بشر ہیں نہ کہ عشرہ مبشرہ۔

مولوی نذیر احمد نے ''زہد'' کا عنوان قائم کر کے مولویوں سے گلہ کیا کہ انہوں نے لوگوں کو زہد کا

۱۴۔ ماخذ سابق، ص ۱۰۵

غلط تصور دیا ہے اور زہد کی غلط تعلیم دی ہے۔ انہوں نے زہد کو اس طرح پیش کیا جیسے مذہب اور دنیا کا کوئی آپس میں رشتہ نہیں ہے۔حالانکہ مذہب اعتدال سکھاتا ہے کہ دنیا بھی کمائے اور عابد و زاہد بھی بنے۔زہد اور دنیاداری دونوں فطری چیزیں ہیں۔یہ دونوں الگ الگ نہیں ہوسکتیں۔شرط صرف یہ ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے انسان اپنے خالق سے غافل نہ ہوجائے۔زہد کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

زہد کا خیال بھی ایک طرح کا فطری خیال ہے۔زندگی کے مخمصوں سے قطع نظر:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

آدمی کُلُّ مَنۡ عَلَيۡهَا فَانٍ [(اے پیغمبر) جتنی مخلوقات (روئے) زمین پر ہے سب فنا ہوجانے والی ہے] کو لازمی طور پر واقع ہوتا ہوا دیکھتا ہے۔اور یہ بھی دیکھتا ہے کہ موت سفر ہے جس سے باز گشت نہیں۔مفارقت ہے جس کی انتہا نہیں، بے تعلقی ہے جس میں لگاؤ نہیں، انقطاع ہے جس کا پیوند نہیں۔اس حالت کو دیکھ کر خواہی نخواہی آدمی کو دنیا کی طرف سے افسردگی پیدا ہوتی ہے۔اسی کا نام زہد ہے۔پس زہد بتقاضائے فطرت ہوا۔پھر ایک طرف طبیعت زہد کی متقاضی ہے اور دوسری طرف زندگی بھی ہر ایک کو عزیز ہے۔

لوگوں کی بناوٹ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ ان کو دنیا کی مرغوب چیزوں یعنی مثلاً بیبیوں اور بیٹوں اور سونے چاندی کے بڑے بڑے ڈھیروں اور عمدہ عمدہ گھوڑوں اور مویشیوں اور کھیتی کے ساتھ دل بستگی بھلی معلوم ہوتی ہے حالانکہ یہ تو دنیا کی زندگی کے چندروزہ فائدے ہیں اور ہمیشہ کا اچھا ٹھکانہ تو اسی اللہ کے ہاں ہے۔مذہب کا کام یہ ہے کہ متناقص تقاضوں میں آدمی کو اعتدال پر لے چلے۔سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔یعنی آدمی دنیا میں باہمہ اور بے ہمہ زندگی کرے کہ نہ تو بالکل تارک الدنیا ہو جس سے ابطال حکمت الٰہی لازم آئے اور اس کو نباہ بھی نہ سکے۔[۱۵]

انہوں نے قرآن و حدیث سے یہ بتانے کی کوشش کی کہ اسلام جہاں ہمیں زہد کی تعلیم دیتا ہے وہیں وہ دنیاداری کی تعلیم بھی دیتا ہے۔جہاں کئی جگہوں پر دنیا کی مذمت پیش کی گئی ہے وہیں دوسری جگہوں پر دنیا کمانے کی ترغیب بھی ملتی ہے اور اللہ نے مختلف نعمتیں دے کر ہم پر احسان کیا ہے اور احسان اسی چیز کا جتایا جاتا ہے جو عمدہ اور پسندیدہ ہو۔اس بحث کو وہ مختصر طور پر ان الفاظ میں سمیٹنے کی

۱۵۔ ماخذ سابق،ص ۱۰۶

کوشش کرتے ہیں:

الغرض دنیا جوہر اور دین عرض یعنی دنیا کو شریعت کی پابندی کے ساتھ برتنے کا نام ہے دین ورنہ دین خود جداگانہ کوئی چیز نہیں۔[۱۶]

''دیگر مذاہب اور اصول اسلام'' کے تحت انہوں نے اسلام کا موازنہ دیگر مذاہب سے کرتے ہوئے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام اور اس کی تعلیم فطرت سے مناسبت رکھتی ہے جب کہ باقی مذاہب فطرت سے ہٹے ہوئے نظر آرہے ہیں جن کی بہت ساری چیزیں انسان سمجھنے سے قاصر ہیں۔انہوں نے ہنود اور یہود کی مثالیں پیش کی ہے کہ وہ کھانے پینے کے معاملات میں سخت گیر ہیں۔اسی طرح عیسائیوں کا عقیدہ تثلیث تین کو ایک اور ایک کو تین تسلیم کرنے کا مطالبہ کرنا بھی کسی بھی اعتبار سے درست نہیں ہے۔رہی اسلام کی بات تو وہ انسانوں سے مشکل احکام کے بوجھ اتارتا ہے اور ان کے گلے کے طوق ان سے نکال کر پھینک دیتا ہے۔اسلام نے معاملات درست کرنے پر سب سے زیادہ زور دیا ہے جو دیگر مذہبوں میں دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔اسلام نے ان معاملات میں فیصلہ کر دیا ہے جہاں انسان کو کشمکش میں پڑنے کا احتمال ہو اور بہت سے معاملات کو''انتم اعلم باموردنیاکم'' کہہ کر انسان کے دائرۂ اختیار میں دیا جو مناسب ہو وہ فیصلہ کرے۔ یہ کہہ کر اللہ کے رسولؐ نے انسان کی زندگی کو آسان کر دیا۔وہ اس مذہب کو مذہب ماننے کے لئے تیار ہی نہیں ہے جو دنیا کی اصلاح اور معاملات کو زیر بحث نہ لاتا ہو۔

''مسلمانوں کی اصلاح حالت'' کے عنوان کے تحت ڈپٹی نذیر احمد نے مسلمانوں کو پھر سے مشورہ دیا کہ وہ قرآن کے مطالب سمجھنے کی کوشش کریں۔ جہاں قرآن کے الفاظ معجزے ہیں وہیں اس کے مطالب بھی کسی معجزے سے کم نہیں۔ایسی تعلیمات خدا کے سوا کوئی دے نہیں سکتا۔مگر افسوس اس بات کا ہے کہ اکثر لوگ قرآن کو بطور تعویذ استعمال کرتے ہیں اور کچھ لوگ قرآن کو نظر بد سے بچنے کے لئے اور وبا ٹلنے کے لئے جزدانوں میں رکھ کر گھروں میں رکھتے ہیں۔ یہ سارے ایسے کام ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں بلکہ اصل میں یہ شرک اور کفر سے قریب کرنے والے کام ہیں۔اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے مسلمانوں کے اندر دین و دنیا کے غلط تصور کو صحیح کرنے کی کوشش کی کہ

۱۶۔ ماخذ سابق،ص ۱۰۸

مسلمانوں نے دین کو آخرت کے معنی میں لیا ہے اور اسی غلط تصور کی وجہ سے وہ دنیا میں رو بہ زوال ہیں۔لوگوں نے دین و دنیا کو دو الگ الگ چیزیں تصور کیا ہے جب کہ اسلام دین و دنیا میں تفریق کا قائل نہیں ہے۔

ان کا ماننا ہے کہ جو اعمال دنیا اور اعمال آخرت میں فرق کرے گا وہ ''اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ'' (البقرہ:۲:۸۵) کی وعید میں شامل ہے۔ان کے بہ قول وہ مکمل مسلمان بھی نہیں ہیں۔ وہ حقوق اللہ کی فکر تو کرتے ہیں لیکن حقوق العباد سے غفلت برتتے ہیں۔ یہ رویہ مسلمانی کے خلاف ہے کہ کچھ احکام کو تسلیم کیا جائے اور کچھ سے اعراض کیا جائے۔ڈپٹی نذیر احمد نے ''خیر القرون'' والے مسلمانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ صحابۂ کرام مجتہد مسلمان تھے جب کہ بعد کے مسلمان یا تو موروثی مسلمان ہیں یا انہوں نے دوسرے لوگوں کو دیکھ کر اسلام قبول کیا ہے۔اس طرح انہوں نے مسلمانوں کو تقلیدی مسلمان کے بجائے مجتہد مسلمان بننے پر زور دیا ہے جو فطرت کی راہوں سے ہو کر گزرتا ہے۔

مولانا محمد عبدالحق حقانی کی تفسیر حقانی

فضل الرحمٰن اصلاحی
معاون رفیق دارالمصنّفین، اعظم گڈھ

مولانا ابومحمد عبدالحق حقانی ؒ کا شمار برصغیر کے انیسویں صدی کے نمایاں مفسرین میں ہوتا ہے۔ مولانا حقانیؒ نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد مدرسہ فتح پوری شاہی مسجد دہلی میں ایک طویل مدت تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ انگریزی حکومت نے علمی خدمات کی بنیاد پر ان کو 'شمس العلماء' کا خطاب دیا۔ میر محبوب علی خان والی حیدرآباد (متوفی ۱۹۱۱ء) نے ان کے لیے وظیفہ جاری کیا، تاکہ وہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنا علمی اشتغال جاری رکھ سکیں۔ انہیں 'فن مناظرہ' سے بھی کافی دل چسپی تھی۔ اسلام کے علاوہ ہندو اور عیسائی مذاہب پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ وہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے مرید بھی تھے۔ اپنے مرشد کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> جس قدر (اولیاء) سے یہ کمترینِ اسلام راقم الحروف مشرف ہوا ہے، ان میں سے حضرت مولانا فضل رحمٰن مرادآبادی قدس اللہ سرہ بھی اس مرتبہ کے شخص تھے کہ جن کی کرامات و برکات دیکھنے والے اب تک سینکڑوں شخص موجود ہیں۔[۱]

مولانا حقانیؒ کے مختصر حالاتِ زندگی: ان کی پیدائش ''کمتھلہ'' گاؤں ضلع انبالہ میں ۲۷ رجب المرجب ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں ہوئی۔ والد کا نام محمد منیر حنفی تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی، مزید تعلیم کے لیے کان پور کا سفر کیا۔ اور یہاں پر استاذ العلماء مولانا لطف اللہ علی گڑھیؒ اور اپنے ہم نام مولانا عبدالحق بن غلام محمد حسینیؒ سے تعلیم حاصل کی۔ کان پور سے مرادآباد جا کر مولانا عالم علی مرادآبادیؒ کی شاگردی اختیار کی۔ اور ۱۹۰۲ء میں سید نذیر حسین دہلویؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر علمِ حدیث کی تکمیل کی۔ ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔

۱۔ عبدالحق حقانی، البیان فی علوم القرآن، دارالاشاعت حقانی، دہلی۔ ۱۳۲۴ھ، ص ۶۴

مولانا کے بارے میں مولانا سید عبدالحی لکھنوی صاحب نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے کہ مولانا حقانی خوش اخلاق اور شیریں کلام تھے اور غلط نظریات والوں سے بحث ومباحثہ میں بڑی مدلل اور مسکت گفتگو میں مہارت رکھتے تھے۔[۲]

تصنیفی خدمات: مولانا حقانی کی کئی مؤلفات ہیں، ان میں خاص طور پر یہ کتابیں شامل ہیں:

۱۔تفسیر حقانی: یہ پانچ جلدوں میں ہے۔اس کا اصل نام ''فتح المنان فی تفسیر القرآن'' ہے لیکن اس کو شہرت تفسیر حقانی کے نام سے ملی۔ اس تفسیر کے سرِ ورق پر اس کا تعارف کچھ اس انداز سے کرایا گیا ہے کہ:

سلف صالحین کی عمدہ تفاسیر کا لبِّ لباب، نیز اس تفسیر میں جملہ مذاہب کے حالات، مخالفینِ اسلام کے اعتراضات کے مدلّل جوابات، مصطلحات ونکاتِ قرآن، نیز فقہی مسائل وغیرہ پر جامع روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲۔ البیان فی علوم القرآن (مقدمہ تفسیر حقانی)،۳۔تعریف القرآن ۴۔عقائد اسلام ۵۔التعلیق النامی علی الحسامی

تفسیر حقانی خود مولانا حقانی کی نظر میں: مولانا حقانیؒ نے اپنی تفسیر کے متعلق لکھا ہے کہ:

> اس میں روایت کو کتب حدیث سے اور درایت کو اس فن کے علماء محققین سے نہایت احتیاط سے لیا گیا ہے۔اور مقصد لوگوں کو کلام ربانی کا سمجھانا ہے۔اس لیے اس میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ کیا گیا ہے:

(۱) اردو میں اصل مطالب قرآن کی وضاحت

(۲) شان نزول کی تفصیل احادیث صحیحہ کی روشنی میں

(۳) آیاتِ احکام میں اوّلاً مسئلہ منصوصہ کا ذکر، پھر ائمہ کے اختلاف اور ان کے دلائل کا بیان

(۴) ایک ہی قرأت کے موافق وجہِ اعراب کا بیان

(۵) اختلافی مسائل میں مشہور ترین اختلاف کا ذکر

(۶) قرآن مجید کی بلاغت نکات کی صورت میں

(۷) احادیث کے انتخاب میں، صرف صحاحِ ستّہ ہی سے اخذ واستفادہ

۲۔مولانا عبدالحی ،نزہۃ الخواطر، ج ۸ دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدرآباد، ۱۹۷۰ء، ص ۲۳۲

(۸) قرآنی قصوں کے بیان میں صحیح روایت کا التزام

(۹) ربط آیات پر خاص زور

(۱۰) مخالفین کے اعتراضات کا تحقیقی اور مدلل جواب

(۱۱) تفسیر کے اندازِ بیان کے متعلق لکھتے ہیں: نفسِ ترجمہ میں تفسیر کو دو قوسوں میں بیچ میں لایا اور مکرر تفاسیر کی عبارت کے ترجمہ کرنے اور رطب و یابس قصے بھرنے اور کسی خاص مذہب کی تائید کرنے سے کہ حق و ناحق اس کی تائید کی جاوے گی، اس سے اجتناب کیا گیا ہے۔

(۱۲) یہ تفسیر زمانۂ حال کے متعلق باتوں کے علاوہ، سلف کی عمدہ تفاسیر کا لبّ لباب اور عجیب وغریب کتاب ہے۔[۳]

تفسیر حقانی کے مقدمہ پر ایک نظر: مولانا حقانیؒ نے ایک طویل مقدمہ ۲۱۲ صفحات میں سپرد قلم کیا ہے۔ جس کے تین ابواب ہیں۔ باب اول میں انتظام معاش، انتظام معاد، نبی اور رسول اور اولیاء میں فرق کرامت وارہاص وغیرہ، اقسامِ ملائکہ، ملائکہ کی حقیقت، جنّ کی حقیقت، تحقیقِ شیطان، سید احمد خاں صاحب کے دلائل کا جواب، مسلمان کو ملائکہ کے موجود اور مخلوق ہونے پر یقین۔ وغیرہ جیسے عناوین پر گفتگو ہے۔

باب دوم میں الہام و وحی، الہامِ انبیاء، صورتِ نزول قرآن، جبرئیل علیہ السلام قرآن کہاں سے لاتے تھے۔ سیدّ احمد خان صاحب کو غلطی کہاں پیش آئی، قرآن کیوں کر جمع کیا گیا، جہاد، سرّ جہاد، ترجیحِ اعجاز قرآن، شانِ نزول، شرح غریب، حذف، و ابدال، ومحاورات اور محکم و متشابہ، اختلافِ قراءت وغیرہ کے مباحث ہیں۔

باب سوم میں عہد عتیق، تحریف کتب آسمانی کا ثبوت، امثال سلیمان، عہد جدید، وجوہِ فقدان انجیل شریف، وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ مقدمہ علوم القرآن کی بحث پر مشتمل ہے۔ اسی لیے اس کو کتابی صورت میں الگ سے بھی شائع کیا گیا ہے۔ اور یہ 'البیان فی علوم القرآن' کے نام سے مشہور ہوا۔

ترجمہ وتفسیر کی خصوصیات: تفسیر حقانی میں سب سے پہلے ربطِ آیات، سورہ کے فضائل، شانِ نزول وغیرہ پر گفتگو ہے۔ مولانا حقانیؒ ان مفسرین میں شامل ہیں، جو نظم قرآن اور ربط آیات کے قائل ہیں۔

ترجمہ کا انداز سورۃ الفاتحہ سے کیا جاسکتا ہے:

۳۔ عبدالحق حقانی دہلویؒ، مقدمہ تفسیر حقانی، جلد اول، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، سن ندارد، ص ۲۱۲

ہر طرح کی ستائش اللہ ہی کے لیے ہے، جو کل جہانوں کا پرورش کرنے والا ہے، جو نہایت رحم کرنے والا، بڑا مہربان، جزا کے دن کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے (ہر کام میں) مدد مانگتے ہیں۔ ہم کو سیدھے رستہ پر چلا، ان لوگوں کے راستہ پر (چلا) کہ جن پر تو نے فضل کیا، نہ ان کے رستہ پر کہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا، نہ گمراہوں کے راستہ پر (آمین)

سورہ فاتحہ کی تفسیر قریب ۵۶ صفحات میں ہے۔ تفسیر کا انداز یہ ہے کہ، فضائل، مسائل فقہیہّ، فروعات، اسرار مجموعۂ سورہ، علمِ شریعت، علم طریقت، اور علم حقیقت وغیرہ جیسے ذیلی عناوین قائم کیے گئے ہیں۔ اور اسرار مجموعۂ سورہ کے تحت جو نکات بیان کئے گئے ہیں، ان کا خلاصہ اس طرح ہے:

۱۔ اس سورہ میں پانچ چیزوں کا تعلق خدا تعالیٰ سے ہے اور پانچ کا بندوں سے متعلق ہے۔ خدا تعالیٰ کے تعلق سے پانچ عنوان ہیں: اللہ، رب، رحمٰن، رحیم اور مالک۔

اور بندوں سے متعلق جو پانچ باتیں ہیں وہ ہیں: عبادت، استعانت، طلبِ ہدایت، طلبِ استقامت اور طلبِ نعمت اور غضبِ الٰہی سے پناہ۔

۲۔ جب بندے نے مقام مناجات میں کمالات وصفاتِ باری تعالیٰ کا الحمدللہ سے لے کر مالک یوم الدین تک ملاحظہ کیا تو اسے بے اختیار شوق الی اللہ پیدا ہوا...... اور جب کہ راہ زنوں سے خوف پیدا ہوا تو غیر المغضوب علیھم و لا الضالیّن کہا۔

۳۔ اس تھوڑے سے کلام میں نہایت خوش اسلوبی سے خدا تعالیٰ نے وہ تینوں علم بیان کر دیے ہیں، جن کے لیے انبیاء علیہم السلام آئے اور ان کے قبول وتصدیق کے لیے معجزات وآیات دکھائے۔ اس لئے اس سورۃ کو تمام کتب سماویہ کا خلاصہ کہیں تو بجا ہے اور سب کا عطر کہیں تو روا ہے اور اسی بنیاد پر نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ اس سورہ کے برابر توراۃ وانجیل اور قرآن میں کوئی دوسری سورہ نازل نہیں کی گئی۔ [۴]

سبع المثانی اور ام القرآن وغیرہ کے حوالے سے مولانا حقانیؒ نے اس سورہ کی سات آیات سے دیگر کئی اور مذہبی کتابوں کے 'سات جملے' سے مقابلہ و مقارنہ کر کے اس کے امتیازی پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ ان کتابوں میں توراۃ، زبور، دساتیر، رگ وید اور انجیل شامل ہیں۔

۴۔ ماخذ سابق ص ۴۹

سورۃ البقرۃ کے فضائل جو متعدد احادیث مبارکہ میں وارد ہوئے ہیں، ان کو نقل کیا ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ جو شخص دور نبوی ﷺ میں سورہ بقرہ اور آل عمران کا علم رکھتا تھا تو اس کی بڑی عزت و عظمت ہوتی تھی۔ اور مسند امام احمد بن حنبل وغیرہ میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ سورہ بقرہ بمنزلہ کوہانِ قرآن کے ہے۔[۵]

مولانا حقانی نے صحیح مسلم کی اس حدیث کو پیش کیا ہے، جس میں سورۃ البقرۃ اور سورہ آل عمران کو ''الزہراوین'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ہم یہاں پوری حدیث نقل کرتے ہیں :

اقرؤا القرآن فانه یاتی یوم القیامة شفیعا لأصحابه،اقرؤوا الزهراوین البقرة، سورة آل عمران،فانهما تأتیان یوم القیامة کأنهما غمامتان۔[۶]

ترجمہ: قرآن پڑھا کرو، اس لیے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کے حق میں روزِ قیامت شفیع ہوگا اور زہراوین یعنی سورہ بقرہ اور آل عمران کو پڑھا کرو۔ بلاشبہ یہ دونوں سورتیں قیامت کے دن بدلیوں کی شکل میں آئیں گی۔[۷]

سورۃ البقرۃ کی آیت (۹۲) کا ترجمہ وتفسیر درج ذیل ہے:

واذ اخذنا میثاقکم ورفعنا فوقکم الطور خذوا مآ آتیناکم بقوّة واسمعوا قالوا سمعنا و عصینا واُشربوا فی قلوبهمُ العجل بکفرهم قل بئسما یأمرکم به ایمانُکم ان کنتم مؤمنین۔

ترجمہ: اور (یاد کرو) جب کہ ہم نے تم سے عہد لیا تھا اور تم پر کوہِ طور کو اٹھایا کہ جو تم کو ہم نے دیا ہے (تورات) اس کو مضبوط ہو کر لو اور سنو، انہوں نے کہا کہ سن تو لیا، لیکن مانیں گے نہیں۔ اور ان کے دلوں میں تو ان کے کفر کی وجہ سے بچھڑا سرایت کر گیا تھا۔ (اے نبی ﷺ!) کہہ دو کہ اگر تم ایمان دار ہو تو تمہارا

۵۔ ماخذ سابق ص ۲۷

۶۔ الراوی: النواس بن سمعان الانصاری، صحیح مسلم: ۸۰۴

۷۔ مولانا نے زہراوین کے متعلق تشریح کی ہے جو یہاں خاص طور پر نقل کی جاتی ہے۔ (زہراوین زہرا کا تثنیہ ہے اور زہرا ازہر کا مؤنث ہے۔ جس کے معنی نہایت روشن کے ہیں۔ چوں کہ ان دونوں سورتوں اعنی بقرہ وآل عمران میں ایک عجیب نورانیت ہے کہ جو نفوسِ صافیہ کو معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے ان دونوں سورتوں کا لقب زہراوین ہو گیا۔ (تفسیر حقانی جلد اول ص ۳۷)

ایمان تم کو بہت ہی بُرا حکم دے رہا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں بنی اسرائیل (یہودیوں) کی ذہنیت کو بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

........اول تو تم نے خود موسیٰ علیہ السلام کے معجزات بیّنات کا انکار کیا اور انبیاء کو قتل کیا۔

دوم جس کتاب کو تم اپنا سمجھتے ہو، اس کو بھی تو تم نے نہ مانا حالانکہ جب وہ تم کو دی گئی تھی، تو اس وقت کوہِ طور کو تم پر بلند کیا تھا، اور تم نے یہ جان لیا تھا کہ اگر اب اس کو نہیں لیتے ہیں، تو ہم پر پہاڑ آپڑتا ہے۔

اس وقت بھی تمہارا حال یہ تھا، زبان سے تو تم نے سمعنا کہا یعنی مان لیا اور دل میں عصینا یعنی نہیں مانا۔ اس کا باعث یہ تھا کہ باوجود معجزات وکرامات بے شمار دیکھنے کے تم نے بچھڑا بنا کے پوجا وہ خباثت تمہارے دلوں میں اس طرح رچ گئی تھی کہ جس طرح زمین پانی کو پی لیتی ہے، پھر حسبِ استعداد نبات اُگاتی ہے......اور اگر تمہارے ایمان کا یہی فتویٰ ہے کہ تم ایسی باتیں کرو، تو اے نبی ﷺ! ان سے کہہ دو کہ یہ بہت برا فتویٰ ہے۔[۸]

ایک اور آیت کا ترجمہ وتفسیر اس طرح ہے:

الطلاق مرّتان فامساك بمعروف او تسريح باحسان ولا يحلّ لكم ان تاخذوا مما آتيتموهن شيئا۔ (سورۃ البقرۃ:۲۲۹)

ترجمہ: وہ طلاق (کہ جس کے بعد رجوع کر سکتے ہو) دو ہی ہیں (اس میں) یا تو دستور کے موافق زوجیت میں رکھے یا اچھی طرح سے چھوڑ دے، اور جو کچھ ان کو دے چکے ہو، اس میں سے کچھ بھی واپس لینا تم کو حلال نہیں۔

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا حقانی نے لکھا ہے:

پہلی آیت میں رجوع کرنے کا ذکر تھا، اس آیت میں اس کو کھول دیا کہ کب تک خاوند کو رجوع پہنچتا ہے۔ فرمایا دو طلاق تک، پھر تیسری طلاق کے بعد بالکل علاقہ منقطع ہو جاتا ہے، مگر جاہلیت میں مرد کے رجوع کی کوئی حد مقرر نہ تھی۔ تین بلکہ دس بیس طلاق دینے کے بعد بھی ایک عرصۂ دراز تک مرد کا عورت پر دعویٰ رہتا تھا۔ اس میں عورت کو بڑی دقّت پیش آتی تھی، چنانچہ ایک عورت نے آکر حضرت عائشہ صدیقہؓ سے یہی شکایت کی، تب یہ آیت نازل ہوئی، جس کا مطلب یہ ہے کہ دو طلاق تک رجوع

۸۔ تفسیر حقانی، جلد اول، ص ۲۲۹

کرنے کا اختیار ہے، پھر اس کے بعد یا تو رجوع کر لے اور حسنِ معاشرت سے میاں بیوی مل کر رہیں، ورنہ اچھی طرح سے چھوڑ دے یعنی پھر رجوع نہ کرے۔[9]

سورۃ الکوثر کا ترجمہ درج ذیل ہے:

اے پیغمبر ہم نے تمھیں بہت کچھ دیا ہے، پھر اسی کی نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ تمہارا بدخواہ ہی پس بُریدہ ہے۔

اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کوثر فوعل کے وزن پر ہے، جس کے لغت میں معنی ہیں ''بہت زیادہ'' کے۔ جس سے مراد خیر کثیر یعنی ہر قسم کی بھلائی اور بہتری اور برتری ہے۔ کوثر سے مراد حکمت ہے۔ امام رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں اس پر بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔[10]

معوذتین کی تفسیر کے ضمن میں ایک سوال یہ قائم کیا گیا کہ، کیا معوّذتین قرآن کا جزو ہیں؟ مولانا حقانیؒ نے جواب دیا:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ایک اختلاف مشہور ہے، وہ یہ کہ ان کے نزدیک یہ دونوں اخیر کی سورتیں کلام الٰہی تو ہیں اور آپ ﷺ پر نازل ہوئی ہیں، مگر قرآن مجید کا جزو نہیں، بلکہ قرآن مجید پر تمام ہو گیا، اور یہ دونوں سورتیں بطور تعویذ و حفاظت کے نازل ہوئی ہیں۔

یہاں یہ عرض ہے کہ یہ تاویل مناسب نہیں معلوم ہوتی، ایک طرف یہ دونوں سورتوں کو کلامِ الٰہی مانتے ہیں، دوسری طرف ان کو قرآن کا جزو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ اس سے مخالفینِ اسلام کو موقع ملتا ہے کہ وہ قرآن مجید کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار شدومد سے کریں۔ کیوں کہ ابن مسعودؓ جیسے صحابی کے بیان کے مطابق یہ دونوں سورتیں الحاقی ہیں، اس اشکال سے پیچھا چھڑانے کے لیے قاضی ابوبکر الباقلانی اور قاضی عیاض وغیرہ نے یہ تاویل کی کہ ابن مسعودؓ معوّذتین کے شاملِ قرآن ہونے کے منکر نہ تھے، بلکہ صرف ان کو مصحف میں درج کرنے سے انکار کرتے تھے، کیوں کہ ان کے نزدیک مصحف میں صرف وہی چیز شامل کی جانی چاہیے، جسے شامل کرنے کی رسول اللہ ﷺ نے اجازت دی ہو۔ اور ابن مسعودؓ تک یہ اطلاع نہیں پہنچی تھی کہ حضور ﷺ نے اس کی اجازت دی ہے۔

۹۔ ماخذ سابق ص ۸۲

۱۰۔ تفسیر حقانی جلد پنجم، ص ۳۰۳-۳۰۴

مگر جمہور صحابہؓ ابن مسعودؓ کے اس قول کو تسلیم نہیں کرتے۔ کیوں کہ حضرت ابی بن کعبؓ نے جب رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا، تو آپ ﷺ نے ان کے متعلق فرمایا تھا کہ مجھے جیسا جبرئیل علیہ السلام نے کہا ویسا ہی میں نے کہا۔ یعنی ان کو بھی جبرئیل لائے ہیں اور وہ قرآن کا جزو ہیں۔[۱۱]

اس بحث میں مولانا حقانی نے اس مسئلہ پر بھی گفتگو کی کہ ''آنحضرت ﷺ پر سحر ہوا تھا یا نہیں؟''۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ اکثر اہل علم ومفسرین کے نزدیک مدینہ میں لبید بن اعصم یہودی نے اپنی بیٹیوں سے آپؐ پر جادو کرایا تھا۔

۲۔ ''نفاثات فی العقد'' میں اس کی لڑکیوں کی طرف اشارہ ہے۔ اس جادو ہی کے اثر سے آپؐ سخت علیل ہو گئے تھے۔

۳۔ اور اس کی وجہ سے دو روز تک بیماری کی کیفیت آپ ﷺ پر طاری تھی، پھر جبرئیل علیہ السلام نے اس کی بابت جب اطلاع دی تو حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ متعینہ کنویں سے وہ تاگا اور جو کچھ تھا نکال لائے۔ جوں جوں اس کی گرہیں کھلتی جاتی تھیں۔ آپ ﷺ کو آرام ہوتا جاتا تھا۔

۴۔ معتزلہ اور قاضی عیاض وغیرہ ان روایات کا صاف انکار کرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ''واللہ یعصمك من النّاس'' یعنی اللہ تعالیٰ تجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا، پھر اس کی حفاظت میں کون خلل انداز ہو سکتا ہے؟

۵۔ اس کا جواب جمہور مفسرین یہ دیتے ہیں کہ لوگوں سے محفوظ رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ تجھے کوئی قتل نہ کر سکے گا۔ جیسا کہ کفار ارادہ رکھتے تھے۔ یہ نہیں کہ کوئی بیماری یا جسمانی مضرت یا کوئی ایذا بھی نہ پہنچے گی۔ پھر یہ حضرات سوال کرتے ہیں کہ غزوہ اُحد میں آپ ﷺ کے دندانِ مبارک کیسے شہید ہو گئے؟ اور خیبر میں جو ایک یہودی عورت نے گوشت میں زہر دیا تھا، وہ کیوں کر آپ ﷺ کی ذات پر اثر انداز ہوا؟

۶۔ ہمارے نزدیک بظاہر معتزلہ اور منکرین روایت کا موقف کمزور معلوم ہوتا ہے۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودیؒ کا کہنا ہے کہ جس طرح بیماری نبی اور غیر نبی کو لاحق ہوتی ہے ایسے ہی جادو بھی اثر انداز ہو سکتا

۱۱۔ ماخذ سابق ص ۳۳۴

ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

......اگر آپ ﷺ کو زخمی کیا جاسکتا تھا، جیسا کہ جنگ احد میں ہوا، اگر آپ ﷺ گھوڑے سے گر کر چوٹ کھا سکتے تھے، جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے، اگر آپ ﷺ کو بچھو کاٹ سکتا تھا، جیسا کہ کچھ اور احادیث میں وارد ہوا ہے، اور ان میں سے کوئی چیز بھی اس تحفظ کے منافی نہیں ہے، جس کا نبی ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے وعدہ کیا تھا، تو آپ ﷺ اپنی ذاتی حیثیت میں جادو کے اثر سے بھی بیمار بھی ہوسکتے تھے۔ نبی پر جادو کا اثر ہوسکتا ہے، یہ بات تو قرآن مجید سے بھی ثابت ہے۔[12]

سحروا اعین الناس (آیت:۱۱۶)

فاذا حبالهم وعصيّهم يخيّل اليه من سحرهم انها تسعىٰ فاوجسَ فی نفسه خیفة موسىٰ قلنا لاتخف انك انت الاعلىٰ والقِ ما فی یمینك (آیت ۶۶ تا ۶۹)

نقد وتبصرہ: اس بحث کے خلاصہ کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ:

۱۔ تفسیر حقانی سلف صالحین کی تفسیروں کا تتبع ہے۔ جمہور مفسرین کی تفسیروں سے یہ الگ نہیں ہے، مفتی عبداللطیف رحمانیؒ نے مولانا حقانیؒ کے مرشد مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کا ایک دل چسپ تبصرہ ان کی تفسیر کے متعلق نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

مولوی عبدالحق مفسرّ حقانی اپنی تفسیر لے کر حاضر خدمت ہوئے۔ اور تفسیر پیش کی، اور عرض کیا کہ یہ تفسیر میں نے لکھی ہے، اگر اس میں کوئی غلطی ہو تو مجھے مطلع فرمائیں۔ آپ نے فرمایا: ''والی الابل کیف خلقت'' کی کیا تفسیر تم نے کی ہے؟ انہوں نے وہی معنیٰ جو عام مفسرین لکھتے ہیں بتادیے۔ اس پر آپ نے قہقہہ لگایا اور کہا کہ ایسی تفسیر لکھی ہے، ابل کے معنی یہاں ابر کے ہیں۔[13]

۲۔ تفسیر میں کلامی رنگ غالب ہے، کیوں کہ آج سے ایک صدی سے زائد عرصہ قبل جب یہ تفسیر لکھی گئی تھی، تو اس وقت کے حالات اسی نہج کے متقاضی تھے۔

۳۔ عصر حاضر کے اعتبار سے اس کا ترجمہ اب رواں نہیں رہ گیا۔

۱۲۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن جلد ۶، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۲۰۱۸ء، ص ۵۵۶

۱۳۔ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی، دارالعلوم ندوۃ العلماء، ۱۳۷۷ھ، ص ۱۳۸-۱۳۹

۴۔ آخری جلد میں چند صفحات ''جغرافیۃ العرب'' کے عنوان سے دیے گیے ہیں، ان میں چند نقشہ جات بھی ہیں، یہ جدّت ہے۔

۵۔ تفسیر پر اگر نئے انداز سے کام کیا جائے تو اس کی افادیت میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ مثلاً: فہرست مضامین بغلی سرخیوں کے بجائے ابتدا ہی میں دینے کی ضرورت ہے۔

۶۔ آخر میں مراجع کتب کی ایک فہرست مرتب کی جائے، نیز احادیث کی تخریج کی ضرورت ہے۔

حضور اکرمؐ اور تصور مساوات

گلزار احمد بٹ

ریسرچ اسکالر (اسلامک اسٹڈیز، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی، اونتی پورہ، کشمیر)

msam8064@gmail.com

منیب احمد

ریسرچ اسکالر (اسلامک اسٹڈیز، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی، اونتی پورہ، کشمیر)

wanimuneeb765@gmail.com

جس معاشرہ کے افراد اونچ نیچ ذات پات، بھید بھاؤ امیر وغریب، رنگ ونسل کے اعتبار سے بٹے ہوئے ہوں اس میں آپسی تلخیاں اور عداوتیں بہت جلد پیدا ہو جاتی ہیں اور ایسا معاشرہ بہت کم عرصہ میں زوال پذیر ہو جاتا ہے۔حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانیت کو جو پائیدار علمی، عملی اور فکری اقتدار عطا کی ہیں ان میں وحدت ومساوات انسانی ایک عظیم قدر ہے۔حضور نبی اکرم ﷺ کا عطا کردہ مساوات وہ انقلاب آفریں تعلیم ہے کہ جس سے نسلی وقبائلی برتری کے بت پاش پاش ہو گئے۔ یہ مساوات ہمیں اسلامی زندگی کے ہر گوشے میں نظر آتی ہے، چاہے وہ انفرادی زندگی کا معاملہ ہو یا خانگی و عائلی زندگی، قانونی وعدالتی معاملات ہو یا سماجی ومعاشی یا ریاستی امور غرض اسلامی معاشرہ میں مساوات کو ہر جگہ پیش نظر رکھنا نبویؐ فکر کا اصل الاصول قرار پایا۔اللہ پاک نے قرآن پاک میں فرمایا ہے:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْاِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ـاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ[1] ۔

(اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تمہارے طبقات اور قبیلے بنا دیے تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم سب میں عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو۔ بے شک اللہ سب کچھ جانتا ہے، باخبر ہے۔)

۱۔القرآن: الحجرات ۴۹:۱۳

تفاخر کا نظریہ صرف غیر مہذب عربوں تک محدود نہ تھا بلکہ روئے زمین پر جو متمدن اور شائستہ قومیں آباد تھیں وہ سب کی سب کسی نہ کسی صورت میں اس بیماری میں مبتلا تھیں۔ کہیں اپنی نسل اور قومیت پر فخر کیا جاتا تھا۔ کہیں ان کے وطن کی سرزمین ان کی بڑائی اور برتری کا باعث تھی۔ کہیں زبان و رنگ وجہ افتخار بنے ہوئے تھے۔ اس فاسد نظریہ نے مختلف قوموں کو متحارب گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ہر قوم اپنی نسلی شرافت اور اپنے خطۂ زمین کی عظمت کے باعث اپنا یہ حق سمجھتی تھی کہ وہ دوسرے ممالک کو تاخت و تاراج کرے، ان کی دولت کو لوٹے، ان کے باشندوں کو اپنا غلام بنائے اور انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرے۔ اس شر انگیز نظریہ کے باعث جنگ و جدال کا لامتناہی سلسلہ جاری رہا اور شرفِ انسانی کی قبا تہذیب و تمدن کے علمبرداروں کے ہاتھوں تار تار ہوتی رہی۔ یہ گمراہیاں صرف اس زمانہ میں ہی موجود نہ تھیں جنہیں ازمنہ مظلمہ کہا جاتا ہے بلکہ آج بھی ان کی ہلاکت آفرینیوں سے انسانیت کی جبیں شرم کے مارے عرق آلود ہوتی رہتی ہے۔ اپنی قومی برتری کا یہ غرور تھا جس نے جرمن قوم میں ہٹلر کا روپ اختیار کیا اور کروڑوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وطنیت، قوم، رنگ، نسل اور زبان کے بتوں کی پوجا آج بھی اسی زور شور سے ہو رہی ہے۔

یہ صرف حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قائم کردہ نظام ہی ہے کہ جس نے ان تمام بنیادوں کو منہدم کر دیا جن پر مختلف قوموں نے اپنی اپنی برتری اور شرافت کے ایوان تعمیر کر رکھے تھے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانیت کے سامنے اس وقت مساوات کا درس دیا جب قریش نسبی تفاخر میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ اپنے سوا تمام انسانوں کو ہیچ سمجھتے تھے۔ ان کی نظروں میں خدا کی بادشاہت فقط ان ہی کے لئے تھی۔ وہ اپنے آبائی مذہب پر فخر کرتے اور اپنی نسلی نجابت پر اتراتے تھے۔ مگر ہادی عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت کم عرصے میں تعلیمات قرآنی کے موثر ذریعے سے اس بات کا قلع قمع فرما کر ایک ایسی عالمگیر برادری قائم کی جس کا اصل الاصول مساوات تھا اور جس کی تاسیس مواخات، محبت، عفو اور کرم پر تھی۔ اس برادری کا طغرائے امتیاز یہ تھا کہ سب ایک دوسرے کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ وہ برادری تھی جس میں ایک سیاہ فام حبشی اپنے تقوی سے ایک قریشی شہزادے سے زیادہ معزّز ہو گیا۔ اس مساوات نے ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ آقا اور غلام قانون کی نظر میں برابر ہو گئے۔

خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر صحابہ کرامؓ کے عظیم اجتماع سے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الا، لا فضل لعربی علی عجمی و لا لعجمی علی عربی و لا لأحمر علی اسود و لا الأسود علی احمر اِلا بالتقوی۔[۲]

(بیشک! کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر اور کسی سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر سوائے تقویٰ کے فضیلت حاصل نہیں ہے) یہی وہ انقلابی تصورات تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حبشی غلام کو مؤذن مقرر فرمایا اور ایک غلام حضرت زیدؓ کی شادی اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحشؓ سے کی۔

یورپ آج اس بات پر اتراتا ہے کہ اس نے غلامی کا سد باب کیا، اس کی روک تھام کے لیے قانون وضع کئے مگر جو امتیازی سلوک وہ ایک دوسرے کے ساتھ روا رکھتا ہے، وہ صاف صاف بتاتا ہے کہ اس آزادی کا دوسرا نام غلامی ہے اور وہ قدیم زمانہ کی غلامی سے بھی بدتر ہے۔ پہلے صرف جسم غلام ہوتے تھے اب روح اور دماغ کو غلام بنایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہادی عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سلوک غلاموں کے ساتھ کیا تھا آیئے اس کے لیے خطبہ حجۃ الوداع سے ہی استشہاد کرتے ہیں:

اے مسلمانو! تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں۔ ان سے اتنا ہی کام لو جتنا آسانی سے وہ کر سکیں۔ ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرو جیسا کہ تم اپنے دوستوں اور عزیزوں سے روا رکھتے ہو۔ جو اپنے لئے ناپسند کرتے ہو وہ ان کے لئے بھی ناپسند کرو جو خود کھاؤ وہی ان کو بھی کھلاؤ، جو خود پہنو وہ انہیں بھی پہناؤ۔[۳]

کیا کسی مذہب یا تہذیب کا علمبردار اور کوئی مقنن غلاموں کے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار آج تک کر سکا ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ اخلاقی بلندی صرف محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عطا کردہ نظام میں ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عطا کردہ حقِ مساوات صرف عمومی یا سماجی و معاشرتی نوعیت ہی کا نہیں بلکہ قانونی اور ریاستی سطح کا بھی حامل ہے۔ اسلامی ریاست کے تمام شہری یکساں حیثیت کے

۲۔ احمد بن حنبل، المسند ۵:۴۱۱، رقم ۲۳۵۳۶

۳۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: دار السلام، حیدر آباد تلنگانہ، ۲۰۱۸ء، ۲:۲۰۴

حامل ہیں۔ اسلام کے عطا کردہ قوانین کے نفاذ کے باب میں شہریوں سے کسی بھی نوعیت کا امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا بلکہ حقوق و فرائض کہ تعیّن کے لئے جب بھی قانون کے نفاذ کی ضرورت پڑے گی وہ مساوی بنیادوں پر نافذ کیا جائے گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اسوۂ حسنہ اس نوعیت کے بے شمار نظائر کا حامل ہے۔ جیسا کہ درج ذیل احادیث مبارکہ سے ظاہر ہے:

ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ قریش کو اس عورت کی خاندانی شرافت کا خیال آیا جس نے فتح مکہ کے موقع پر چوری کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کی سفارش کرے گا؟ انہوں نے کہا کہ صرف اسامہ بن زید ہی ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لاڈلے ہیں۔ اس عورت کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا تو اسامہ بن زید نے اس کے حق میں سفارش کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چہرہ انور کا رنگ متغیر ہوگیا اور فرمایا کیا اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدوں میں سے ایک حد میں سفارش کر رہے ہو؟ حضرت اسامہ عرض کرنے لگے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مجھے معاف فرما دیجئے۔ جب عشاء کا وقت ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہوئے اور خطبہ دیا اللہ تعالیٰ کی اس کے لائق تعریف کی پھر فرمایا: بے شک تم سے پہلی قومیں اس لئے ہلاک ہوئیں کہ جب بھی کسی امیر نے چوری کی تو انہوں نے اسے چھوڑ دیا اور جب کبھی کسی کمزور نے چوری کی تو اس پر حد قائم کر دیتے اور میں وہ ہوں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں ضرور اس کے ہاتھ کاٹتا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حکم دیا اور اس عورت کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔[۴]

ہجرت کے دوسرے سال ۱۲؍رمضان المبارک بروز ہفتہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم اپنے تین سو تیرہ (۳۱۳) صحابہ کرام کے ہمراہ مدینہ منورہ سے میدان بدر کی طرف کوچ کر رہے تھے۔ امن عالم اور تحفظ انسانیت کے لئے کوچ کئے ہوئے اس قافلہ کے ساتھ صرف ایک گھوڑا اور اسی (۸۰) اونٹ تھے۔ اس صورتحال کو مدّ نظر رکھ کر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہر تین صحابہ کے لئے ایک اونٹ مقرر فرمایا جس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہٖ وسلم نے انہیں باری باری سوار ہونے کا حکم فرمایا حتیٰ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہٖ وسلم نے اپنی سواری مبارک کو بھی اپنے لئے خاص نہیں

۴۔ ابن ہشام۔ السیرہ النبویۃ، ۲:۲۰۳

فرمایا بلکہ آپ ﷺ نے بھی اپنی سواری میں سیدنا علیؓ اور مرثد بن ابی مرثدؓ کو شریک کر لیا۔ کیونکہ اس نورانی قافلہ کی روانگی کا مقصد ہی یہی تھا کہ باطل کی ہٹ دھرمی، گمراہی و حق تلفی ختم کی جائے اور عدل و انصاف اور مساوات انسانی کا پیغام عام کیا جائے۔ مدینہ طیبہ سے جب قدسیوں کا یہ لشکر نکلتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اونٹنی پر سوار ہیں۔ مقررہ مسافت طے کرنے کے بعد آپؐ اتر جاتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیتے ہیں کہ ان میں سے ایک سوار ہو جائے۔ وہ عرض کرتے ہیں کہ ان کی باری بھی آپؐ ہی سوار رہیں، اس سے انھیں مسرت ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے ہیں کہ یہ پیشکش صدق دل سے کی جارہی ہے لیکن آپؐ ان کی مخلصانہ پیشکش کو قبول نہیں فرماتے بلکہ انھیں یوں جواب دیتے ہیں:

مَـا اَنْتُـمَا بِاَقْوٰی مِنِّی وَلَااَنَا اَغْنِیُ عَنْکُمَا مِنَ الْاَجْرِ [5] (نہ تم مجھ سے زیادہ طاقت ور ہو اور نہ یہ بات ہے کہ تمہیں مجھ سے زیادہ اجر و ثواب کی ضرورت ہے)۔

چرخِ پیر نے بھی ایسا منظر کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ لشکر کا سپہ سالار، امت کا سردار اور مجاہدین کا محبوب قائد ناقے کی نکیل ہاتھ میں لیے پیدل چل رہا ہے اور ایک سپاہی اونٹنی پر سوار ہے۔ اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم نے ساری دنیا کو عملی طور سے مساوات انسانی کا ایک عظیم درس دیا۔

مسجد نبوی کی تعمیر کا وقت آتا ہے۔ صحابہؓ کرام اس کی بنیادیں کھود رہے ہیں۔ پتھر اور گارا اٹھا اٹھا کر لا رہے ہیں۔ حضور ﷺ اپنی چادر مبارک اتار کر رکھ دیتے اور اینٹیں اٹھا اٹھا کر لاتے، صحابہ بھی اپنے آقا ﷺ کی اتباع میں اینٹیں اور گارا ڈھونے لگے، ان کے لبوں پر یہ شعر مچل اٹھے:

لئن قعدنا والنبی یعمل   لذاك منا العمل المضلّل

(اگر ہم بیٹھ گئے جبکہ نبیؐ کام کر رہے ہیں تو ہمارا یہ عمل گمراہی ہوگا)

جنگ احزاب کے دوران عرب کے سارے مشرک قبائل نے ۲۴؍ ہزار کی بڑی فوج لے کر نہتے مسلمانوں سے لڑنے کے لیے مدینہ منورہ پر دھاوا بول دیا۔ اسلام کے اس مرکز کے دفاع کے لئے خندق کھودنے کا منصوبہ طے ہوا۔ صحابہؓ کرام کی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہاتھ میں کدال لیے خندق کھودنے میں مصروف ہیں جب کہ گیسوئے عنبریں پر مٹی گر رہی ہے، روئے زیبا پر گرد پڑ رہی ہے اس روح پرور منظر کو دیکھ کر مجاہدین اسلام پر کیف و مستی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور وہ بے ساختہ یہ کہہ اٹھتے ہیں:

۵۔ مشکوٰۃ، کتاب الحدود، باب الشفاعۃ فی الحدود، فصل اول: رقم: ۳۴۴۷

نحن الذین بایعوا محمداً علی الجھاد ما بقینا ابدًا

(ہم میں جنہوں نے محمد سے جہاد پر اس وقت تک کے لئے بیعت کی ہے جب تک ہم باقی ہیں)

صحابۂ کرام بار بار عرض کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تکلیف نہ فرمائیں مگر اس کام میں آپ اسی انہاک سے مشغول رہے۔ مٹی کھودی جاری تھی، رجز پڑھے جارہے تھے۔ حضور نبی اکرم ﷺ بھی مٹی کی ٹوکریاں بھر بھر کر لاتے اور دوسروں کے ساتھ رجز خوانی کرتے۔[۶]

کیا مساوات کی ایسی شاندار مثال تاریخ انسانیت میں مل سکتی ہے اور کیا یہ وہ مساوات نہیں جس پر عمل کرنے سے انسانی دکھوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے، دنیا کا اضطراب مٹ سکتا ہے اور سارا جہان امن، سکھ اور طمانیت قلب حاصل کر سکتا ہے؟ مساوات کے حوالے سے کیا پژمردہ قلوب میں روح حیات دوڑانے کے لئے یہی ایک واقعہ کافی نہیں!

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی سفر سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ راستے میں پڑاؤ ہوا۔ مختلف حضرات کو مختلف ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ کوئی خیمے نصب کر رہا ہے، کوئی سواری کے جانوروں کے چارے کا انتظام کر رہا ہے کوئی پانی بھر کر لا رہا ہے، کوئی آٹا گوندھ رہا ہے۔ سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ چپکے سے وہاں سے اٹھ کر کہیں چلے جاتے ہیں۔ صحابۂ کرام کچھ دیر بعد حضورؐ کو اپنے درمیان نہ پا کر بے چین ہو جاتے ہیں۔ بے چینی اور اضطراب بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ صحابہ کرام کو دور سے ایک نورانی پیکر نظر آتا ہے اور جب قریب ہوتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ جاتے ہیں کہ ان کے آقا و مرشد جنگل سے لکڑیاں چن کر ان کا گٹھر جا کر اپنے سر پر اٹھائے ہوئے لا رہے ہیں۔ صحابۂ کرام عرض کرتے ہیں: یا رسول اللہ ﷺ آپ نے یہ زحمت کیوں گوارا کی کیا ہم اس خدمت کے لیے کافی نہ تھے؟ حضور ﷺ بڑی سادگی سے فرماتے ہیں: ''یہ سچ ہے مگر میں یہ پسند نہیں کرتا کہ تم میں اپنے آپ کو ممتاز کروں۔ خدا اس بندے کو پسند نہیں کرتا جو اپنے ہمراہیوں سے ممتاز بنتا ہے۔''[۷]

آخری ایام میں جب آپؐ نے رومیوں کی روک تھام کے لئے فوج روانہ کرنے کا ارادہ کیا تو اکابر

۶۔ جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری، حضور نبی رحمت ﷺ بحیثیت معلم اخلاق، مکتبہ مجددیہ، پاکستان ۲۰۱۲ء، ص ۲۳-۲۴

۷۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی، محاضرات سیرت، مکتبہ احسان لکھنؤ ۲۰۱۶ء، ص ۱۳۳، علم الدین سالک، مساوات کا علمبردار، نقوش رسول نمبر شمارہ ۱۳۰، جنوری ۱۹۸۴ء، ادارہ فروغ اردو، لاہور

صحابہ کی موجودگی میں حضرت اسامہ بن زید کو امیر عساکر مقرر فرمایا، حضرت اسامہ آپؐ کے آزاد کردہ غلام زیدؓ کے بیٹے تھے۔ اس وقت سینکڑوں قریشی اور ہاشمی مدینہ منورہ میں موجود تھے۔ آپؐ ان میں سے کسی کو منتخب فرما سکتے تھے، مگر مساوات کی عملی تعلیم دینے اور نسبی فخر مٹانے کے لئے آپؐ نے حضرت اسامہؓ کو نامزد فرمایا۔ جس نے یہ ثابت کر دیا کہ آپؐ درحقیقت پیغمبر مساوات اور اس دنیا میں رنگ و نسل کے بت توڑنے آئے ہیں۔

مساوات انسانی کے حوالے سے سیرت نبوی ﷺ کی ایک اہم اور نمایاں دستاویز خطبہ فتح مکہ ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تاریخی خطبہ میں ارشاد فرماتے ہوئے انسانی مساوات اور وقار کے منافی قوانین اور طبقاتی و نسلی امتیازات کے خاتمہ کا اعلان یوں فرمایا:

اے جماعت قریش! بے شک اللہ نے تمہاری جاہلانہ نخوت اور آباء واجداد پر فخر کرنے کا غرور آج مٹا دیا۔ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنائے گئے۔[۸]

پھر مساوات اور عدالت کے اقدار عالیہ کے عملی ثبوت کے تحت آپ نے اپنے انتقال سے قبل یہ اعلان عام کرایا:

فمن کنت جلدت له ظهراً فهذا ظهری فلیستقدمنه
و من کنتُ شتمُت له عرضاً فهذا عرضی فلیستقدمنه۔[۹]

(سن لو! میں نے اگر کسی کی پیٹھ پر کوئی ضرب لگائی ہے تو میری پیٹھ حاضر ہے وہ مجھ سے بدلہ لے، اور سن لو اگر کسی کو میں نے گالی دی ہے وہ بھی مجھ سے بدلہ لے لے۔)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی قائم کردہ نظام مساوات انسانی کو دیکھ کر یورپی مؤرخ فلپ ہٹی (Philip K. Hitti) تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

اس ادارے نے ہر زمانے میں اسلام میں ایک بڑی متحد تاثیر اور متنوع مومنین کے درمیان سب سے زیادہ مؤثر مشترک بندھن کے طور پر کام کیا ہے۔ اس نے تقریباً ہر قابل مسلمان کو اس کی زندگی میں

۸۔ مسند الدارمی: ۲:۳۱۴، طبقات ابن سعد: ۲۵۵، بحوالہ پیغمبر اسلامؐ اور بنیادی انسانی حقوق از حکیم محمود احمد ظفر: بیت العلوم، لاہور، ۱۳؍دسمبر ۲۰۲۰ء ص ۱۵

۹۔ الذہبی، میزان الاعتدال، ج ۳، ص ۳۸۲

ایک بار (حج کا) سفر کرنے پر مجبور کیا۔ زمین کے چاروں کونوں سے مومنین کے بھائی چارے کے ایسے اجتماع کے سماجی اثر ورسوخ کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس نے حبشیوں، بربروں، چینیوں، فارسیوں، شامیوں، ترکوں، عربوں، امیروں اور غریبوں، اعلیٰ اور ادنیٰ سب کو دنیا بھر کے مذہبی عقیدے کی مشترکہ بنیاد پر آپس میں بھائی چارے اور مل بیٹھنے کا موقع فراہم کیا۔ دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام نے نسل، رنگ اور قومیت کی رکاوٹوں کو ختم کرنے میں سب سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔[۱۰]

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے کردار وعمل کو خلق محمدیؐ کے سانچے میں ڈھال لیں۔ صرف اسی صورت میں ہم نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو اور قانون اسلام کی مثالی شان اور برکتوں کو دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں اور مادیت گزیدہ انسانیت کو وہ تریاق پیش کر سکتے ہیں، جس کی اسے اشد ضرورت ہے اور جس کے ہم امین ہیں۔

۱۰۔ Hitti, Philip, History of the Arabs, Macmillan, New York, 1937, p. 136

بین المذاہب مکالمے میں اسلامی تصوف کا کردار

نیاز احمد لون

سینئر ریسرچ فیلو شعبۂ اسلامیات، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، اونتی پورہ (کشمیر)

niyazahlone@gmail.com

ڈاکٹر شیخ جمیل علی

سینئر اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی،

اونتی پورہ (کشمیر)

sheikh.jameil@gmail.com

بین المذاہب مکالمہ مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان تعاون کو برقرار رکھنے کے لئے مختلف مذاہب کے عقائد، روایات اور تجربات کو سمجھنے کے لیے پرامن ماحول میں مختلف نظریات یا عقائد کے پیروکاروں کے درمیان تعامل کا نام ہے۔ یہ تعامل انفرادی سطح پر ہوسکتا ہے اور اجتماعی سطح پر بھی۔

مسلمانوں اور دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان بین المذاہب مکالمے کی ایک طویل تاریخ ہے۔ بین المذاہب مکالمے میں اپنے عقیدے کا وسیع علم حاصل کرنا اور پرامن بقائے باہم کے لئے دیگر مذہبی روایات کی جامع اور مستند فہم شامل ہے۔ بین المذاہب مکالمے کے لیے مذہبی رواداری، مثبت ذہنیت، ایمانداری اور باہمی اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے۔ مزید برآں، مکالمے کے عمل میں شامل افراد کو چیزوں کا تجزیہ کرتے وقت تنقیدی نقطہ نظر اپنانا چاہیے۔

اسلام اپنے آغاز ہی سے بین المذاہب مکالمے کی بات کرتا ہے۔ مختلف قرآنی آیات ایسی ہیں جو بین المذاہب مکالمے کی حمایت کرتی ہیں۔ مزید برآں، احادیث بھی اس رجحان کو اہمیت دیتی ہیں۔ اسی طرح اسلامی تصوف، اسلامی تعلیمات کا ایک روحانی پہلو ہونے کی حیثیت سے بین المذاہب مکالمے کی وسیع گنجائش رکھتا ہے۔ اپنی پرامن نوعیت کی وجہ سے، تصوف بین المذاہب مکالمے کو فروغ

دینے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ چونکہ اسلامی تصوف زیادہ سے زیادہ اللہ کی معرفت کے حصول پر توجہ مرکوز کرتا ہے، لہذا اس کی تعلیمات میں بین المذاہب مکالمے کو انتہائی اہمیت ہے تاکہ اللہ کے بارے میں پختہ علم حاصل کیا جا سکے اور بندوں کے درمیان باہمی تعاون اور پرامن بقائے باہم پرورش پائے۔ اسلامی تصوف کی تعلیمات میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو بین المذاہب مکالمے کے لئے ضروری ہیں جیسے انکسار، سخاوت، صبر اور محبت۔ اس مقالے میں بین المذاہب مکالمے میں اسلامی تصوف کی اہمیت کا جائزہ لیا گیا ہے

تعارف: مکالمہ دو یا زیادہ افراد یا دو فریقوں کے درمیان بات چیت کا ایک عمل ہے، جس میں خوشگوار اور دوستانہ ماحول میں معاملات کو خوش اسلوبی سے سمجھا جاتا ہے۔ بات چیت افراد، فریقوں، یا ممالک کے درمیان ہو سکتی ہے۔ مکالمے کی مذہبی، سماجی اور سیاسی اہمیت ہے۔ ایک معاشرے کو دوسرے معاشرے کے ساتھ عقائد اور ثقافتی اقدار کا تبادلہ کرنے کے لئے مکالمے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ایک پرامن ماحول تشکیل دیا جا سکے جو ایک صحت مند معاشرے کی ضمانت دیتا ہے۔ مکالمے کے عمل میں شامل افراد یا فریقین سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے خیالات کو سنیں، ان کا احترام کریں، اور ایک دوسرے کے نقطہ نظر کے تئیں خلوص، ہمدردی، عاجزی اور احترام کا مظاہرہ کریں اور ایک مشترکہ فیصلے تک پہنچنے کے لئے محنت کریں۔

جدید معاشروں کی متنوع نوعیت کی وجہ سے بین المذاہب مکالمہ ایک ناگزیر ضرورت بن گیا ہے۔ ہم ایک ایسے معاشرے میں رہ رہے ہیں جس میں متنوع مذہبی روایات، عقائد اور طرز عمل، مختلف نسلی، ثقافتی، معاشی اور سیاسی پس منظر موجود ہیں۔ لہذا یہ متنوع سماجی ڈھانچہ ایک دوسرے کی بہتر سمجھ کے لیے سماجی، مذہبی، اور سیاسی سطح پر مکالمے کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ بین المذاہب مکالمہ ایک طرف معاشرے میں پرامن اور سازگار ماحول پیدا کرنے اور اپنے مذہب کو صحیح طریقے سے سمجھنے اور دوسری طرف دوسرے مذاہب کے بارے میں وسیع علم حاصل کرنے کا مؤثر طریقہ ہے۔ مزید برآں، موجودہ دنیا میں مذہب کی مسلسل اہمیت اور ضرورت کو ثابت کرنے کے لئے بین المذاہب مکالمہ ضروری ہے۔ بین المذاہب مکالمہ موجودہ دنیا میں مذہب کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے۔

ایسے معاشرے میں ہم آہنگی کے ساتھ رہنا ضروری ہے جو ثقافتی اور مذہبی تنوع کی خصوصیت رکھتا

ہے۔اس کے لئے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں مکالمے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بین المذاہب مکالمہ مذہبی علوم کا ایک حصہ ہے۔ درحقیقت اسلام اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان تنازعات کو ختم کرنے کے لیے بین المذاہب مطالعات متبادل طریقہ کار میں سے ایک ہے۔ مولانا رومی (م: ۱۲۷۳ھ) مشہور صوفی بزرگ نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ رومی اپنی شاعری کے ذریعے مذہب اور انسانیت کو اہمیت دیتے ہیں۔

اسلام تمام انسانوں کے ساتھ مساوی سلوک کرتا ہے۔قرآن مجید میں ارشاد ہے: ''اے لوگو! اور ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔تم میں سے سب سے افضل وہ ہے جو خدا سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے۔اللہ سب کچھ جاننے والا اور سب کی خبر رکھنے والا ہے'' (الحجرات۔۱۳: ۴۹)۔قرآن پاک کی اس آیت میں دو اہم نکات پر روشنی ڈالی گئی ہے، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو ایک جوڑے سے پیدا کیا ہے، اس لیے ثقافت، نسل، وغیرہ کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہوسکتی ہے، اور دوسرا اللہ نے لوگوں کو قبیلوں میں تقسیم کیا ہے تا کہ وہ ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔اسلام نے اپنے آغاز سے ہی اپنے ماننے والوں سے کہا ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ شفقت اور خلوص کا مظاہرہ کریں۔ایک عالمگیر نظریہ ہونے کی حیثیت سے اسلام بین المذاہب مکالمے کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید میں ارشاد ہے: ''کہہ دو کہ اے اہل کتاب ہم ایک مشترکہ بات عام کریں کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے اور ہم میں سے کوئی بھی اللہ کے سوا کسی اور کو رب نہ بنائے گا۔اور اگر وہ منہ موڑ لیں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو ہم نے خدا کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا'' (آل عمران۳: ۶۴)- کائنات کی متنوع صورت ہونے کے باوجود اسلام انسانوں کے درمیان اتحاد پر یقین رکھتا ہے۔

تصوف اور بین المذاہب مکالمہ: مسلمانوں اور دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان بین المذاہب مکالمے کو فروغ دینے میں اسلامی تصوف کے کردار پر دو طرح سے غور کیا جا سکتا ہے۔ ایک مذہبی اور دوسرا اخلاقی۔ جہاں تک مذہبی شعبے کا تعلق ہے تو اسلامی تصوف اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ تمام الٰہی مذاہب کی جڑ الوہیت ہے۔لہذا، تمام الٰہی مذاہب خدا کے علم کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

مزید برآں، مسلمان صوفیہ کا ماننا ہے کہ سچائی میں تمام عقائد کا اپنا حصہ ہوتا ہے، لہذا ہمیں ان تمام عقائد کو بین المذاہب مکالمے کے ذریعے دیکھنا چاہیے تاکہ مطلق سچائی کو ظاہر کیا جا سکے۔ اسلامی تصوف بین المذاہب مکالمے کے ذریعے سچائی کو دریافت کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ خدا نے تمام انسانوں کو ایک مشترکہ تعمیر کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ لہذا تمام انسانوں میں خدائی فطرت پائی جاتی ہے۔

اسی طرح اخلاقی اعتبار سے اسلامی تصوف کی تعلیمات میں وہ تمام صفات پائی جاتی ہیں جیسے سخاوت، صبر اور ہمدردی جو نتیجہ خیز بین المذاہب مکالمے کے لیے لازمی شرائط ہیں۔ مزید برآں عاجزی اور رواداری اسلامی تصوف کی دو بڑی خصوصیات ہیں جو ایک کامیاب بین المذاہب مکالمے کے لیے ضروری ہیں۔

تصوف اسلام کا ایک اہم پہلو ہے جو مذاہب کے تقابلی مطالعے سے متعلق سوالات کا حل بتا سکتا ہے۔ آج اسلامی دنیا میں جدید اثر ورسوخ کے پھیلاؤ نے تقابلی مذہب کے سنجیدہ مطالعے کو ایک لازمی بنا دیا ہے، اس لئے اسلامی تصوف اپنی تعلیمات کے ذریعے اس ضرورت کو پورا کر سکتا ہے۔ قرآن پاک کے روحانی پہلوؤں کی صوفیانہ تشریحات بین المذاہب مکالمے کے عمل میں مصروف تمام لوگوں کے لئے ایک عمدہ طریقہ ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ صوفیہ مختلف مذاہب کو ایک دوسرے سے الگ الگ اور لازمی طور پر بنیاد پرست عقیدے کے مخالف نظام کے طور پر نہیں دیکھتے۔ صوفی وہ ہے جو کثرت سے وحدت کی طرف سفر کرنا چاہتا ہے اور خاص طور پر عالمگیریت تک۔ اس کے لئے تمام شکلیں شفاف ہو جاتی ہیں، بشمول مذہبی شکلیں۔ اس طرح اس کے سامنے ان شکلوں کی اصلیت ظاہر ہوتی ہے۔

اسلامی تعلیمات کی سب سے اہم جہت تصوف ہے جسے عصر حاضر کی دنیا میں انفرادی سطح سے اجتماعی سطح تک اور سماجی سطح سے لے کر معاشی اور سیاسی سطح تک انسانیت کو درپیش چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ لالچ اور محبت اور انصاف کا فقدان کچھ ایسے مسائل ہیں جو قدرتی طور پر انسانیت کے استحصال اور معاشرے میں دیگر مہلک نتائج کو دعوت دیتے ہیں۔ یہ مسائل معاشرے کو بری طرح متاثر کرتے ہیں اور اس کے اخلاقی ڈھانچے کے لئے نقصان دہ ہیں۔ مختلف ثقافتوں، مذاہب اور نسلوں کے لوگوں کے درمیان تفہیم، تعاون اور بقائے باہمی کا فقدان معاشرے میں مسائل کو جنم دیتا ہے۔ بین المذاہب مکالمہ ان مسائل کا ممکنہ حل ہے۔

لہذا اسلامی تصوف بین المذاہب مکالمے کے عمل کے ذریعے مختلف پس منظر سے تعلق رکھنے والے انسانوں کی سمجھ میں ایک عمدہ کردار ادا کرسکتا ہے۔ اسلامی تصوف تمام افراد کی زندگی کو کسی بھی فرق سے قطع نظر مثبت اور پرامید انداز میں دیکھتا ہے۔ یہ لوگوں کے شعور کو معاشرے کے تئیں ذمہ داریوں کے بارے میں بیدار کرتا ہے، انہیں اخلاص کی طرف راغب کرتا ہے، اور اس طرح اخلاقیات روحانیت اور انسانی اقدار پر مبنی ایک صحت مند معاشرے کو تشکیل دیتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اسلامی تصوف بین المذاہب مکالمے کے ذریعے مختلف عقائد اور مذہبی روایات کے پیروکاروں کے درمیان بقائے باہمی پر یقین رکھتا ہے۔

اسلامی تصوف لوگوں کی نہ صرف روحانیت کو فروغ دیتا ہے بلکہ یہ لوگوں کو باہمی مفاہمت کے ذریعے جوڑتا ہے اور انہیں معاشرتی مسائل کے خلاف اجتماعی طور پر لڑنے کے قابل بناتا ہے۔ اسلامی تصوف کی متحد نوعیت کی وجہ سے اس کی اہمیت ہر جگہ دیکھی جاسکتی ہے۔ اسلامی تصوف بنیادی طور پر تعلیم اور بین المذاہب مکالمے کی سرگرمیوں کے ذریعے توجہ حاصل کرتا ہے۔ ان سرگرمیوں کا مقصد رواداری، پرامن بقائے باہمی اور مذہبی وسعت پر زور دیتے ہوئے مختلف ثقافتی اور مذہبی برادریوں کے درمیان روابط قائم کرتا ہے۔

مثال کے طور پر تصوف نے انڈونیشیا میں اسلام کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا، جس کا اہم عنصر شمولیت اور رواداری ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ بنگلہ دیش کی اکثریت نے صوفیوں کے اثر ورسوخ سے اسلام قبول کیا۔ بنگلہ دیش کے مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی صوفیوں کو اپنی روحانی حکمت اور رہنمائی کا منبع سمجھتی ہے۔ یہ دلیل دی گئی ہے کہ صوفیوں کا سب سے بڑا کارنامہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہم آہنگی اور بقائے باہم کا فروغ ہے۔

تصوف، اسلام کی مخفی جہت کے طور پر نہ صرف ذاتی تقوی میں شامل اندرونی پہلوؤں پر توجہ مرکوز کرتا ہے، بلکہ یہ مسلمانوں کو اپنی ذاتی پرہیزگاری کو اجتماعی طور پر معاشرتی تقویٰ کے ساتھ متوازن کرنے میں بھی مدد کرتا ہے۔ تصوف میں تقویٰ کی ان دونوں شکلوں میں تضاد نہیں ہے بلکہ وہ ایک سکے کے دو رخ کی طرح لازم وملزوم ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تصوف میں ذاتی پرہیزگاری صرف سماجی تقویٰ کے ذریعے ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نقشبندی جیسے صوفی طریقے اپنے ارکان کو

اپنی برادری کی سماجی زندگی میں حصہ لینے کی دعوت دیتے ہیں۔نقشبندی حقانی نظام کی تعلیمات میں جو بین المذاہب مکالمے سے متعلق ہیں، ہمیں ذاتی اور سماجی اتحاد کی زندہ مثال ملتی ہے۔انڈونیشیا کے تناظر میں مذہبی تعددیت ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ صوفیوں کو اپنے ذاتی اور سماجی تقویٰ کے کردار کو برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہے۔

مذاہب کا تنوع خدا کی طرف سے ایک نعمت ہے، اور اس طرح کے تنوع میں، ان کے پیروکار خدا کی محبت کا تجربہ کر سکتے ہیں۔ یہ تفہیم ان کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کا خیر مقدم کریں اور انہیں اپنے جیسے انسانوں کے طور پر قبول کریں جن کے ساتھ وہ خدا کی محبت کا اشتراک کرتے ہیں۔نقشبندی مسلک کے دونوں شیخ ناظم اور شیخ ہشام حقیقی رول ماڈل کے طور پر کام کرتے ہیں اور دکھاتے ہیں کہ کس طرح دوسرے مذہبی پیروکاروں کے ساتھ تعلق خدا سے محبت کے اظہار اور بدلے میں خدا کی محبت کا تجربہ کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

مستند مذہبی عقیدہ میں بین المذاہب مکالمے کو بھی شامل ہونا چاہیے۔اس مکالمے کے ذریعے نقشبندی حقانی نظام کے ارکان اپنے آپ کو روشن خیالی کے لیے کھولنا، زیادہ خود انحصار ہونا اور ایک دوسرے کو علم سے مالا مال کرنے پر توجہ مرکوز کرنا سیکھتے ہیں۔خلاصہ یہ ہے کہ بین المذاہب مکالمہ صرف مذہبی بحث کا موضوع نہیں بلکہ بامعنی تعلقات استوار کرنے کا معاملہ بھی ہے۔

تصوف مذہبی تعددیت کے ذریعے لوگوں میں امن اور محبت اجاگر کرتا ہے۔دنیا میں ہر چیز خدا کی محبت سے آتی ہے اور اس کا تعین کرتی ہے۔ جب لوگ آپس میں خدا سے محبت کی وجہ سے ملتے ہیں، تو ان کے درمیان موجود فرق مٹ جاتا ہے۔لہذا نقشبندی حقانی نظام مذہبی تعددیت کو ایک مثبت حقیقت کے طور پر دیکھتا ہے۔ وہ مذہب کے تنوع کو خدا کی تخلیق کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ یہ سمجھ الحلاج اور ابن عربی جیسے عظیم صوفیہ کی سوچ کے عین مطابق ہے۔ وہ دونوں مذاہب کے درمیان ان اختلافات کو ایک ظاہری اختلاف سمجھتے تھے۔جلال الدین رومی نے بھی اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اختلافات خدا کی محبت کے عالمگیر مظہر ہیں۔

نقشبندی صوفی تعلیمات کے مطابق ایک مذہبی شخص نہ صرف دوسرے اہل مذاہب کی آزادی کا احترام کرتا ہے بلکہ ان کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرنے کی مخلصانہ خواہش بھی رکھتا ہے۔ یہ رویہ

قرآن کی بعض آیات پر مبنی ہے۔ جن کی تعمیل میں ہر مومن کو دوسرے مذاہب کو جاننے اور مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے میں مدد کرنے کے لئے تیار ہونا چاہیے۔

اس طرح کے ہم آہنگ تعلقات کی تعمیر سے مراد وہ مکالمہ ہے جو مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان قائم ہونا چاہیے۔ دوسری مذہبی برادریوں کے وجود کو تسلیم کرنا اور قبول کرنا مکالمے کے بغیر بے معنی ہے۔ یہ صرف براہ راست بات چیت کے ذریعہ ہی ممکن ہے کہ دوسری برادریوں کے ارکان کے ساتھ بامعنی بات چیت ہوسکے۔

تصوف بین المذاہب مکالمے کو مذاہب کے درمیان ایک جدوجہد کے طور پر دیکھتا ہے جس میں مذاہب کے نمائندے اپنے عقیدے کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں اور دوسروں کے عقیدے کی صحیح تفہیم حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس مکالمے کا بنیادی مقصد ایک دوسرے کو سمجھنا اور ایک دوسرے سے سیکھنا ہے۔ اس اصول کے مطابق تمام مذاہب کی بنیاد ایک ہے۔ یہ پیغام مومنوں کے وجودی حق پر زور دیتا ہے کہ وہ اپنے اپنے نبی کے پیغام پر عمل کرنے کے لئے آزاد ہوں۔

تصوف، اسلام کے ایک روحانی پہلو کے طور پر نہ صرف افراد کے اندرونی تزکیہ پر توجہ مرکوز کرتا ہے بلکہ یہ افراد کے درمیان امن، باہمی سمجھ، اور بھائی چارے کے لحاظ سے معاشرے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس میں دوسرے مذاہب کے لوگوں کو مکالمے میں شامل کیا جاتا ہے تاکہ ایک طرف مطلق سچائی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ علم حاصل کیا جاسکے اور دوسری طرف دوسرے مذاہب کے بارے میں علم حاصل کیا جاسکے۔ تصوف لوگوں کو پرامن طریقے سے راہ راست کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اسلامی تصوف کی تعلیمات میں بین المذاہب مکالمے کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔

حوالہ جات

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو، ۱۹۷۹ء

پروفیسر یوسف سلیم چشتی، تاریخ تصوف، اریب پبلی کیشنز، دہلی ۲۰۱۵ء

ڈاکٹر غلام قادر لون، مطالعہ تصوف قرآن وسنت کی روشنی میں، دوست اسوسی ایٹس، لاہور ۱۹۹۴ء

Maulana Wahiduddin Khan, Al-Qur'an (Eng.tr), Goodword, Delhi,2009

Bruinessen, Martian Van Howell, Julia Day (eds.) *Sufism and the 'Modern' in*

Islam, I.B. Tsuris & Co Ltd, New York, 2007

Hasan, Ahmad Husni Haji, *An Islamic Perspective of the Interfaith Dialogue amidst current interreligious Tensions Worldwide,* GJAT (Global Journal of Al-Thaqafah), Dec. 2011, Vol.1, issue 1, pp.25-35

Howell, Julia, "Sufism and the Indonesian Islamic Revival," *The Journal of Asian Studies,* August 2001, Cambridge University Press.

Kazemi, Reza Shah, *The Metaphysics of Interfaith Dialogue,* World Wisdom Books, 2002

Nugroho, Wahyu, "Sufism and Interreligious Dialogue: The Naqshbandi Haqqani Sufi Order in Indonesia," *Teosofia*: Indonesian Journal of Islamic Mysticiism, vol,10, issue. 1, 2021, pp.111-126

Saeedimehr, Mohammad, "Islamic Mysticism and Interreligious Dialogue," *Poligrafi*, December 2020, vol.25, issue 99/100, pp.57-78

Sells, Michael, *Early Islamic Mysticism*, Paulist Press, USA, 1995

Shah, Muhammad Maroof, "Ibn Arabi: Mysticism and Interfaith," *Aligarh Journal of Islamic Philosophy*, vol.,issue, year, N.A., pp.1-30

Shamsuddin, prof. Dr. Salahuddin, "Behaviour of Islam with the followers of other religions," *British Journal of Humanities and Social Sciences,* August 2012, vol.6, issue 2, 2015

Wali-Allah, Shah, *Altaf al-Quds* (Ur.tr. Syed Muhammad Farooq Al-Qadri), Lahore,1998

Wali-Allah, Shah, *Ham'at* (tr. Prof. Muhammad Sarwar), Sind Sagar Academy, Lahore, 1946

مسئلہ فلسطین پر ایک طائرانہ نظر

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

فلسطین مغرب میں بحر ابیض متوسط وصحرائے سیناء اور مشرق میں نہر اردن کے درمیان واقع ایک چھوٹا سا خطہ ہے جہاں قدیم ترین زمانے سے کنعانی یا اموری قوم رہتی آئی ہے۔ یہ تاجر اور کسان لوگ تھے۔مصر سے آنے والے یہودیوں کی انہیں سے لڑائی ہوئی تھی۔ یہودیوں نے ان کو ''فلستینی'' کہا اور اس کے معنی ''شرابی ، کبابی'' کے رکھ دئے۔اس علاقے کے قدیم باشندوں کی غلطی یہودیوں کے نزدیک صرف یہ تھی کہ انہوں نے یہودیوں کے مصر سے نکلنے کے بعد ان کا استقبال ''پانی اور روٹی سے نہیں کیا'' (توریت ،تثنیہ ۲۳) اس لئے وہ گردن زدنی کے مستحق ہوئے۔

یہودی تقریباً ۱۲۲۰ ق م میں حضرت یوشع Jushua کی قیادت میں صحرائے سیناء سے نکلنے کے بعد فلسطین میں داخل ہوئے۔توریت (سفر یشوع) کے مطابق انہوں نے انتہائی وحشیت کے ساتھ فلسطینیوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

کنعانی یبوسی قبیلہ Jebusites بیت المقدس کے اردگرد رہتا تھا۔ یہ لوگ ۱۴۰ ؍سال تک یہودیوں کا مقابلہ کرتے رہے اور صرف ۱۰۴۹ ق م میں حضرت داوٗدؑ اس علاقے پر قبضہ کر پائے۔ شاؤل ۱۰۲۰ ق م میں پہلا حاکم ہوا جس نے سب یہودیوں کو ایک جھنڈے کے تحت جمع کیا۔اس کے بعد حضرت داوٗدؑ آئے جن کا زمانہ ۱۰۰۰-۹۶۱ ق م کا ہے۔انہوں نے ۹۹۰ ق م میں فلسطینی قبائل پر قابو پایا اور دمشق کو خراج دینے پر مجبور کیا۔صرف حضرت داوٗدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں یہودیوں نے فلسطین کے ایک بڑے خطے پر حکومت کی۔

حضر داوٗدؑ کے بعد حضرت سلیمانؑ آئے جن کا زمانہ ۹۲۲-۹۶۱ ق م کا ہے۔انہوں نے بیت المقدس

میں ایک یہودی معبد بنایا جو ''ہیکل'' Temple کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی ایک دیوار آج بھی موجود ہے۔ اس دیوار کو مسلمان مسجد اقصی کی مغربی دیوار (الحائط الغربی) کہتے ہیں جبکہ یہودی اس کو ''دیوار گریہ'' (Wailing Wall) کا نام دیتے ہیں۔ اس سلطنت کے تعلقات یمن تک سے تھے۔ حضرت سلیمان کے ۹۲۲ ق م میں وفات پاتے ہی ان کی سلطنت دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی۔ جنوب میں ''یہودا'' اور شمال میں ''اسرائیل'' نامی دو ملک وجود میں آئے جو آپس میں دو سو سال تک لڑتے رہے۔

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام نے تقریباً ۴۰-۴۰ سال حکومت کی، اس کے بعد سب ختم ہوگیا۔ لڑائیوں وغیرہ کو چھوڑ دیا جائے تو فلسطین پر صرف ۷۰ سال پورے طور پر یہودی حکومت رہی انگریز مؤرخ جفریز (JMN Jafferies, Palestines The Reality)۔

بہترین حالات میں بھی یہودیوں نے پورے فلسطین پر بھی قبضہ نہیں کیا۔ مؤرخ بیلوک کے مطابق بہترین حالات میں بھی اس مملکت کی لمبائی ۱۲۰ میل اور چوڑائی ۶۰ میل تھی (یعنی موجودہ غزہ سے ملتی جلتی)۔ انہوں نے زیادہ تر پہاڑی علاقوں پر قبضہ کیا جبکہ وادی کے علاقے فلسطینیوں کے پاس رہے۔

آشوریوں نے ۷۲۱ ق م میں پہلی بار ''اسرائیل'' کو ختم کر کے یہودیوں کو مشرق کی طرف کھدیڑ دیا اور دوسرے لوگ ان کی آبادیوں میں بسا دئے۔ یوں ان کا تاریخ سے نام ونشان مٹ گیا۔ البتہ دوسری یہودی حکومت ''یہودا'' بچ گئی تھی جس کا صدر مقام اورشلیم تھا۔ ۵۹۷ ق م میں نبوخذ نصر (بخت نصر) نے اس دوسری یہودی حکومت کا بھی خاتمہ کر دیا اور اس کے بادشاہ یواقیم Joacqim سمیت دس ہزار یہودیوں کو یرغمال بنا کر بابل لے گیا۔ ان میں نبی حضرت حزقیال شامل تھے۔ جلد ہی باقی ماندہ یہودیوں نے بغاوت کی جس کی وجہ سے نبوخذ نصر ۵۸۷ ق م میں دوبارہ فلسطین آیا، اور شلیم کی اینٹ سے اینٹ بجادی، مزید بہت سے یہودیوں کو ناکام بنا کر بابل لے گیا اور باقی ماندہ یہودیوں کو اس علاقے سے نکال دیا۔ یوں سلطنت ''اسرائیل'' کے ختم ہونے کے ۱۳۰ سال بعد سلطنت ''یہودا'' کا بھی مکمل طور پر خاتمہ ہوگیا۔

۵۳۹ ق م میں یہودیوں کی بابل کی غلامی ختم ہونے پر واپسی ہوئی۔ ایران کے بادشاہ کورش دوم

نے فلسطین کے علاقے پر قبضہ کرنے کے بعد یہودیوں کو فلسطین میں دوبارہ بسنے کی اجازت دی۔ یوں ۵۱۵ ق م میں دوبارہ ہیکل سلیمانی بنا۔

۶۳ ق م-۷۰م میں فلسطین پر رومن قبضہ ہوا۔ قبضہ پورا ہونے پر یہودیوں کی بغاوت کی وجہ سے ۷۰م میں رومن جنرل ٹائٹس Titus فلسطین آیا اور پوری طرح اورشلیم اور ہیکل کو تباہ کر کے اس کی جگہ ایک رومن شہر بنام ایلیا کاپیٹو لینا بنا کر واپس گیا اور یہودیوں کو وہاں سے پوری طرح سے جلاوطن کر دیا۔

۲۷۳م میں انباط (عربوں) نے اس علاقے پر قبضہ کرلیا۔

۶۳۹ م (۱۵ھ) میں بیت المقدس حضرت عمر کے ہاتھوں فتح ہوا جب وہاں عیسائیوں کی حکومت تھی۔ مسجد اقصیٰ کی جگہ اس وقت کوڑا پڑا ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس جگہ کو اپنے ساتھیوں کی مدد سے صاف کیا اور وہاں نماز پڑھی۔ بعد میں اس جگہ پر ایک مسجد بنی۔ حضرت عمرؓ کے ہاتھوں ''العبد العمری'' نامی وثیقہ لکھا گیا جس میں یہودیوں کا بیت المقدس میں داخل ہونا منع کیا گیا اور یہ وہاں کے عیسائیوں کی درخواست پر ہوا۔

۱۰۹۹ء سے ۱۳۶۹ء تک صلیبی جنگیں جاری رہیں جو فلسطین پر یوروپی عیسائی قوموں کے قبضے کی کوشش تھی کیونکہ ان کے خیال میں حضرت مسیح کی جائے پیدائش کو غیر عیسائیوں کے قبضے میں نہیں رہنا چاہیے۔ کل ۹ صلیبی جنگیں ہوئیں۔ بالآخر اکتوبر ۱۱۸۷ء میں صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس کو صلیبیوں کے ۹۹ سال قبضے کے بعد واپس لیا اور یہودیوں کو دوبارہ بیت المقدس آنے کی اجازت دی۔ انھوں نے بیت المقدس کی حفاظت کے لئے مراکش سے جفاکش مسلمانوں کو بلا کر مسجد اقصیٰ کے پاس بسایا۔ ان کا محلّہ ''حی المغاربۃ'' ۱۹۶۷ء تک باقی تھا۔ جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے بیت المقدس پر قبضے کے بعد چھ گھنٹے کے نوٹس پر ان کو باہر کر دیا اور ان کے گھر مسمار کر کے ''دیوار گریہ'' کے سامنے ایک بڑا میدان بنا دیا جہاں یہودی اب عبادت کرتے ہیں۔

یوروپ میں مستقل برے سلوک اور ابھرتی ہوئی نئی قومیتوں کی وجہ سے وہاں کے یہودیوں میں ''یہودی وطن'' کی بات شروع ہوئی حالانکہ نہ ان کا اپنا کوئی ملک تھا اور نہ ہی کسی علاقے میں ان کی اکثریت تھی۔ آسٹرین صحافی ہرتزل Herzl نے صہیونی تحریک شروع کی۔ ۱۸۶۰ء میں دوبارہ یہودیوں

نے فلسطین میں بسنا شروع کیا۔ اس وقت فلسطین میں یہودیوں کی کل آبادی پانچ ہزار تھی۔ فرانس کے بارون ہرش Baron Hirsh نے اس کام کے لئے پیسے دیے۔ بعد میں برطانیہ کے لارڈ روچائلڈ Lord Rothchild نے بھی اس مقصد کے لئے کافی پیسے دیے تا کہ یہودی فلسطین میں زمینیں خرید کر وہاں بسنا شروع کریں۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانیہ نے بالفور اعلان جاری کر کے فلسطین میں ''یہودی وطن'' بنانے کا وعدہ کیا جبکہ اسی وقت انگریزوں نے سائکس پیکو Sykes Picot معاہدے کے ذریعے فرانس کے ساتھ اس علاقے کو آپس میں بانٹنے اور شریف مکہ سے معاہدہ کر کے اس پورے علاقے میں ''عرب حکومت'' قائم کرنے کا جھوٹا وعدہ کیا۔ جس وقت یہ وعدے کئے گئے، برطانیہ یا فرانس کا اس پورے علاقے کے کسی حصے پر قبضہ نہیں تھا۔

اکتوبر ۱۹۱۸ء میں فلسطین پر برطانوی قبضہ ہو گیا جس کے بعد اعلان بالفور کے تحت فلسطین کو یہودی ہجرت کے لئے کھول دیا گیا۔ ساٹھ سال سے مسلسل ہجرت کے باوجود اس وقت تک فلسطین میں یہودیوں کی تعداد صرف ۵۶۰۰۰ تھی۔

برطانیہ نے فلسطین میں یہودیوں کو ہر سہولت کے ساتھ نیم فوجی دہشت گرد مسلح تنظیم ہاگاناہ Haganah بنانے کی اجازت دی جس کی وجہ سے عملاً فلسطین میں ہر طرح سے مسلح یہودی فوج تیار ہوئی جبکہ عربوں کے اسلحے چھینے گئے اور یہودیوں کے برعکس عربوں کے اسلحہ رکھنے پر جیل اور جلاوطنی کی سزا مقرر ہوئی۔ اس کے علاوہ متعدد یہودی دہشت گرد تنظیموں کا قیام عمل میں آیا مثلاً ارگون، شترن، لیہی اور اتزیل جنہوں نے ۱۹۴۸ء میں عربوں کو اپنے وطن سے بندوق کے ذریعے کھدیڑنے کا کام کیا۔ ان کو بعد میں اسرائیلی فوج میں ضم کر دیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ بہت کم زور ہو گیا تھا۔ برطانیہ کو فلسطین سے بھاگنے پر مجبور کرنے کے لئے اب یہودی دہشت گردوں نے انگریز فوج اور انتظامیہ پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔ فلسطین میں یہودی دہشت گردی کا سامنا کرنا کمزور برطانیہ کے بس میں نہیں تھا، اس لئے اس نے فلسطین کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے اقوام متحدہ کے سامنے پیش کر دیا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء

کو فلسطین کو یہودی اور عرب ریاستوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ عرب اکثریت کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۴۴ فیصد اور یہودی اقلیت کو ۵۶ فیصد دے دیا عربوں نے اس ظالم فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا جبکہ یہودیوں نے مارچ ۱۹۴۸ء سے ہی ''آپریشن دالیت'' کے تحت فلسطین میں اسرائیل بنانے کے لئے عربوں پر حملے اور قتل عام شروع کر دیے تاکہ وہ یہودی سلطنت سے بھاگ جائیں۔ اس کے ردعمل کے طور پر عرب ممالک (مصر، اردن اور عراق وغیرہ) نے فلسطین میں اپنی فوجیں بھیجیں جن کو واضح حکم تھا کہ تقسیم پلان کے تحت یہودیوں کو دیے گئے حصے پر قبضہ نہ کریں۔ یوں عرب فوجیں آگے نہیں بڑھیں جبکہ یہودی دہشت گرد تنظیمیں حملے کر کے عربوں کو قتل اور مختلف علاقوں سے نکالتی رہیں یہاں تک کہ فلسطین کے ۷۰ فیصد عرب اپنے علاقوں سے بھاگ کر قریبی علاقوں اور ملکوں میں پناہ گزیں ہو گئے اور پھر اقوام متحدہ کی بیسیوں قراردادوں کے باوجود آج تک اپنے گھروں کو واپس نہ جا سکے۔

۱۵؍ مئی ۱۹۴۸ء کو یہودیوں نے اسرائیل کے قیام کا اعلان کر دیا اور فلسطین میں خانہ جنگی چھڑ گئی۔ امریکا اور روس نے چند گھنٹوں کے اندر اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔ سنہ ۱۹۴۹ء میں جنگ بندی تک فلسطین میں ۷۸ فیصد زمینوں پر یہودی قبضہ ہو گیا یعنی فلسطین عربوں کے لئے ان کے ملک کا صرف ۲۲ فیصد حصہ بچا۔ اس باقی ماندہ فلسطین کے ایک حصے (مغربی کنارہ بشمول بیت المقدس) پر اردن نے قبضہ کر لیا اور دوسرے حصے (غزہ) پر مصر نے قبضہ کر لیا۔

۵؍ جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل نے حملہ کر کے باقی ماندہ ۲۲ فیصد فلسطین کے ساتھ مصر کے صحراء سیناء اور شام کی جولان پہاڑیوں Golan Heights پر بھی قبضہ کر لیا۔

اکتوبر ۱۹۷۳ء میں مصر اور شام نے اپنے علاقے آزاد کرانے کے لئے جنگ کی۔ مصر نے صحرائے سینا کا ایک تہائی علاقہ واپس لیا جبکہ شام ناکام رہا۔ اس کے بعد ۱۹۷۹ء میں مصری صدر سادات نے اسرائیل کے ساتھ صلح کر لی جس کہ وجہ سے اسرائیل پر دباؤ بہت کم ہو گیا اور دوسرے عرب و غیر عرب ممالک نے اسرائیل کے ساتھ تعلقات قائم کرنے شروع کر دیے۔ اس سے پہلے دنیا کے اکثر ممالک اسرائیل کو تسلیم نہیں کرتے تھے جس میں ہندوستان بھی شامل تھا۔

باقی ماندہ فلسطین پر مسلسل اسرائیلی قبضے کے خلاف فلسطینیوں کا پہلا انتفاضہ دسمبر ۱۹۸۷ء سے

1991ء کی مڈریڈ کانفرنس تک چلا۔

تھک ہار کر بالآخر فلسطینی قیادت نے ۱۹۹۲ء میں اسرائیل کے ساتھ اوسلو معاہدہ کیا جس کی رو سے پانچ سال میں خود مختار فلسطینی ریاست قائم ہونا قرار پایا لیکن فلسطین کے بنیادی مسئلوں (بیت المقدس/ پناہ گزینوں/سرحد/داخلی وسائل) کو بعد کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ پانچ سال کے اندر فلسطینی ریاست وجود میں آنی تھی لیکن تیس سال کے بعد بھی یہ ریاست آج تک وجود میں نہیں آئی ہے۔ فلسطینی اتھارٹی (فلسطینی مقتدرہ) کے نام پر جو علاقہ موجود ہے اس کی حیثیت صرف ایک میونسپلٹی کی ہے اور وہ اسرائیل کے مخبر کے طور پر کام کرتی ہے یعنی اسرائیل کے خلاف مزاحمت کرنے والے فلسطینیوں کے بارے میں اسرائیل کو باخبر کرتی ہے اور اسی وجہ سے وہ فلسطینی عوام میں مقبول نہیں ہے۔

اوسلو معاہدہ کرنے والے اسرائیلی وزیر اعظم اسحاق رابین کو یہودی شدت پسندوں نے ۴/نومبر ۱۹۹۵ء کو قتل کر دیا۔ اسرائیل میں فلسطینیوں سے کسی بھی سمجھوتے کی مخالف لیکوڈ پارٹی نے کلین بریک Clean Break نامی پلان امریکی نیوکون کی مدد سے بنوایا تا کہ اوسلو معاہدے کو عملاً کالعدم کیا جاسکے۔ ۱۹۹۷ء لیکوڈ کے برسر اقتدار آتے ہی اس پلان پر عمل شروع ہو گیا اور دھیرے دھیرے فلسطینی مقتدرہ کو بے اختیار بنانے کے عمل کا آغاز ہو گیا اور فلسطینی حکومت کو دیے جانے والے علاقوں میں یہودی نو آباد بستیاں بنانے کا کام تیزی سے شروع ہو گیا۔ سارا الزام عربوں پر رکھا گیا جبکہ معاہدے کو ناکام بنایا اسرائیل نے۔ اس کے نتیجے میں ۲۰۰۰ء میں دوسرا انتفاضہ شروع ہوا جو پانچ سال چلا۔

مئی ۲۰۱۲ء میں یوسی بیلین Yossi Beilin نے، جو اوسلو معاہدہ کا اسرائیل کی جانب سے آرکیٹیکٹ تھا، فلسطین اتھارٹی کو مشورہ دیا کہ اتھارٹی کو تحلیل کر دو تا کہ دنیا کے سامنے اسرائیل ننگا ہو جائے۔ یہودی نو آبادیاں فلسطینی عربوں کی ان زمینوں پر مستقل قائم ہو رہی ہیں جنہیں اسرائیل بھی مانتا ہے کہ انھیں فلسطینیوں کو واپس کرنا ہے۔

اگست ستمبر ۲۰۰۵ء میں اسرائیل غزہ سے حماس کی مزاحمت کی وجہ سے نکل گیا لیکن علاقے پر بری، بحری اور ہوائی کنٹرول قائم رکھا۔

جنوری ۲۰۰۶ء میں حماس کی منتخب حکومت کو اسرائیل، امریکہ اور یوروپ وغیرہ نے چند مہینوں کے اندر مل کر توڑ دیا اور ۲۰۰۷ء سے اسرائیل نے غزہ کا مکمل محاصرہ شروع کر دیا، جو اب تک جاری ہے۔

غزہ پر اسرائیلی حملے جون ۲۰۰۶ء، ۲۰۰۸ء، ۲۰۰۹ء، ۲۰۱۰ء، ۲۰۱۱ء، ۲۰۱۲ء، ہوئے۔ ۲۰۱۴ء میں رمضان کے دوران اسرائیل نے حملہ کر کے غزہ کو شدید نقصان پہنچایا لیکن مزاحمت کو شکست نہ دے سکا۔ حماس نے ۲۰۱۴ء کی جنگ کا ۱۵/دن تک مقابلہ کیا اور دنیا کی پانچویں سب سے طاقتور فوج کو جنگ بندی پر مجبور کر دیا اور بڑی حد تک اپنے مطالبات منوا لیے۔ اسرائیل اپنے مطالبات (راکٹ کے حملے بند کرانا، غزہ کو اسلحے سے خالی کرانا اور سرنگوں کا خاتمہ) میں ناکام رہا۔

۲۰۱۸ء میں غزہ کے لوگوں نے محاصرے کے خلاف سرحد پر احتجاج شروع کیا جس پر اسرائیل نے فائرنگ کر کے سات فلسطینیوں کو قتل کیا۔

مارچ ۲۰۱۹ء میں اسرائیل نے غزہ پر پھر حملہ کیا۔ اس کے بعد مئی ۲۰۱۹ء، نومبر ۲۰۱۹ء، ۲۰۲۱ء، ۲۰۲۲ء اور مئی ۲۰۲۳ء میں بھی غزہ پر اسرائیلی حملے ہوئے۔ مئی ۲۰۲۱ء میں اسرائیلی حملہ پہلے کی طرح نہ صرف ناکام رہا بلکہ یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حماس اور الجہاد الاسلامی اسرائیل کے ساتھ فوجی برابری deterrence کی حد تک پہنچ چکے ہیں۔ پہلی دفعہ ۲۰۲۱ء میں اسرائیل کا بہت جانی و مالی نقصان ہوا۔ اسرائیل کے اندر فلسطینیوں نے انتقامی کارروائی کی اور اسرائیل کو یکطرفہ جنگ بندی پر مجبور کر دیا۔ اس جنگ کے دوران ۲۴۲/فلسطینی شہید ہوئے، غزہ کے ۸۰۰۰۰/لوگ بے گھر ہوئے اور ۱۷۰۰/رہائشی اور تجارتی یونٹس تباہ ہوئے۔

۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء کو حماس نے اسرائیل پر اچانک بڑا حملہ کیا جو اسرائیل کے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ یہ حملہ ۱۹۶۷ء سے اسرائیلی قبضے اور ۲۰۰۶ء سے جاری اسرائیلی محاصرے کے خلاف تھا۔ یہ حملہ پوری طرح سے بین الاقوامی قانون کے تحت مقبوضہ علاقوں کے باشندوں کے حق مزاحمت کا استعمال تھا۔ اس کے جواب میں اسرائیل نے غزہ کو پوری طرح تباہ کرنا شروع کر دیا۔ جنگ اب چھٹے ماہ میں داخل ہو چکی ہے۔ انسانی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی کہ ایک مختصر اور نہتی آبادی دنیا کی پانچویں بڑی فوجی طاقت کے خلاف اتنے لمبے عرصے تک اتنی بہادری سے لڑتی رہے۔ اس سے پہلے عرب فوجوں کی

اسرائیل سے لڑائی صرف چند دن چلتی تھی۔ اس جنگ میں اسرائیل نے بے دریغ بمباری کی۔ ایک غزہ کے تقریباً ۷۰ فیصد گھر اور بلڈنگیں اس اندھا دھند بمباری سے منہدم ہو چکے ہیں۔ پانی بجلی سیور لائن اور ٹیلیفون وانٹرنٹ کی لائیں پوری طرح تباہ ہو چکی ہیں۔ یہ بمباری دنیا بھر میں پچھلے ایک سو سال میں شدید ترین تھی۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں بھی کسی علاقے پر اتنی شدید بمباری نہیں ہوئی۔ الجزیرہ کے مطابق ۲۰/ مارچ ۲۰۲۴ء تک ۳۱۷۲۶ فلسطینی ہلاک ہوئے (جن میں ۱۳۰۰۰/ بچے اور ۸۴۰۰/ عورتیں شامل ہیں) اور ۷۳۷۹۲/ زخمی ہوئے (جن میں ۸۶۶۳/ بچے اور ۶۳۲۷/ عورتیں شامل ہیں)۔ ان کے علاوہ تقریباً ۸۰۰۰/ لوگوں کی لاشیں اب بھی ان کے تباہ شدہ گھروں کے ملبوں میں دبی ہوئی ہیں اس لئے ان کے نام شہیدوں کی لسٹ میں شامل نہیں ہیں۔ مسلسل اسرائیلی فائرنگ کی وجہ سے ملبوں میں تلاش کرنا فی الحال ممکن نہیں ہے۔

اسرائیل اور امریکہ کا پلان تھا کہ شدید بمباری اور کھانے پینے کی اشیاء کو بالکل روکنے سے غزہ کے لوگ مصر کے صحرائے سینا کی طرف بھاگ جائیں گے اور یوں غزہ کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو جائے گا۔ لیکن غزہ کے لوگوں نے اس سازش کو ناکام بنا دیا۔

غزہ میں مکمل سرائیلی محاصرے کی وجہ سے کھانے پینے کی چیزوں اور دواؤں کی شدید قلت ہے جس کی وجہ سے وہاں درجنوں لوگ خاص طور سے بچے بھوک سے ہلاک ہو چکے ہیں۔ تمام اسپتال تقریباً تباہ اور اکثر بند ہیں۔ اسرائیل نے غزہ کے تقریباً ۱۳/ لاکھ لوگوں کو اپنے اپنے علاقوں سے نکل کر صحرائے سیناء سے ملے ہوئے غزہ کے جنوب مغربی شہر رفح میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا ہے لیکن وہ وہاں بھی اسرائیلی حملوں سے محفوظ نہیں ہیں۔ جہاں موجودہ جنگ سے پہلے غزہ میں روزانہ ۵۰۰/ ٹرک کھانے اور ادویات وغیرہ کے داخل ہوتے تھے، اب وہاں صرف ۸۰/ ٹرک روزانہ داخل ہو رہے ہیں۔ اسرائیل حملوں میں ۱۵/ مارچ تک ۱۰۰/ صحافی قتل ہو چکے ہیں جس میں زیادہ تر فلسطینی ہیں۔

جنوبی افریقہ نے ہیگ میں واقع بین الاقوامی عدالت میں اسرائیل کے خلاف مقدمہ دائر کیا ہے کہ وہ غزہ میں نسل کشی کا ارتکاب کر رہا ہے۔ بین الاقوامی عدالت کا آخری فیصلہ ابھی نہیں آیا ہے لیکن اس نے اسرائیل کی سرزنش کی ہے اور اس کو نسل کشی سے بچنے کو کہا ہے لیکن اس کا اسرائیل پر کوئی اثر نہیں

ہورہا ہے کیونکہ اس کو امریکہ اور مغربی ممالک خصوصاً جرمنی اور برطانیہ کی پوری تایید حاصل ہے۔اس جنگ کے دوران اسرائیل کو بچانے کے لیے امریکہ تین بار اقوام متحدہ کی سکیوریٹی کاؤنسل میں جنگ بندی کی قرارداد کے خلاف ویٹو استعمال کر چکا ہے نیز جنگ کے دوران اسرائیل کی بھرپور جنگی اور مالی مدد کررہا ہے۔ جنگ کے شروع ہوتے ہی امریکہ نے اپنے دو بحری بیڑے علاقے میں بھیج دیے تاکہ کوئی ملک اسرائیل کے خلاف جنگ میں شامل نہ ہوسکے۔ جنگ کے دوران امریکہ نے ہوائی اور پانی کے جہازوں کے ذریعہ مسلسل اسرائیل کو اسلحے فراہم کرائے۔امریکہ اب تک (۲۰۲۳ء) اسرائیل کو ۲۶۰ بلین (ہزار ملین) ڈالر کی امداد دے چکا ہے۔

نسل کشی کے مقدمے کے علاوہ، دنیا کے ۵۲ ممالک نے بین الاقوامی عدالت میں اسرائیل کے خلاف ایک اور مقدمہ دائر کیا ہے کہ غزہ مغربی پٹی اور بیت المقدس پر ۱۹۶۷ء سے جاری اسرائیلی قبضہ ہٹایا جائے۔ابھی اس کا فیصلہ آنا باقی ہے۔افسوس ہے کہ مقدمہ زیادہ تر غیر عرب اور غیر مسلم ملکوں نے دائر کیا ہے۔غزہ کی جارحیت کی وجہ سے متعدد غیر مسلم ملکوں نے اسرائیل سے سفارتی تعلقات توڑ لیے ہیں لیکن کسی عرب یا مسلم ملک کو یہ توفیق نہیں ہوئی بلکہ کچھ درپردہ اسرائیل کی مدد کررہے ہیں۔

اس جنگ کے دوران حزب اللہ اور لبنان کی الجماعۃ الاسلامیہ نے شمالی اسرائیل پر حملے کئے ہیں۔ عراق کی کچھ میلیشیا نے بھی اسرائیلی اور امریکی نشانوں پر حملے کئے ہیں۔یمن کی انصار اللہ حکومت نے باب المندب اور بحر احمر سے اسرائیلی پانی کے جہازوں یا اسرائیل سامان لے جانے والے پانی کے جہازوں پر پابندی لگادی ہے اور اس طرح کے کچھ پانی کے جہازوں پر حملہ بھی کیا ہے جبکہ یمن پر اسی وجہ سے امریکہ اور برطانیہ مستقل حملے کررہے ہیں۔

سارے نقصانات کے باوجود موجودہ جنگ نے اسرائیل کے خلاف پانسہ پلٹ دیا ہے۔اسرائیل کے فوجی تفوق کا دعویٰ اور اس کی بنیاد پر عربوں کا بلیک میل اب قصہ پارینہ بن چکا ہے۔سفارتی طور پر اسرائیل کو ہر جگہ منہ کی کھانی پڑ رہی ہے۔عرب ممالک سے اسرائیل کے تعلقات کی گاڑی رک چکی ہے۔فلسطین کا مسئلہ اب دوبارہ عرب اور مشرق وسطی کی سیاست کا نمبر ایک مسئلہ بن چکا ہے۔حماس اور فلسطینی مزاحمت کو اب کوئی نظر انداز نہیں کرسکتا ہے۔غزہ اور حماس نے اسلامی تاریخ میں ایک نئے

سنہری باب کا اضافہ کیا ہے جو عین جالوت اور حطین کی طرح صدیوں یاد رکھا جائے گا۔

قرآن پاک میں سورہ اسرائیل کی آیات ۴-۸ میں بتایا گیا ہے کہ یہودی فلسطین میں تین بار سرکشی کریں گے اور تینوں بار اللہ پاک ان کو سخت سزا دیں گے۔ اب تک دو بار ہو چکا ہے (۵۸۷ قبل مسیح اور ۷۰ عیسوی) ایک سرکشی ابھی باقی ہے۔ اس سرکشی پر بھی ان کی پہلے کی طرح سرکوبی کی جائے گی۔ شاید اس کا وقت آ گیا ہے۔ آج پہلی بار دنیا اور بالخصوص ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے اکثر ممالک اسرائیل کے خلاف ہیں۔ مغربی ممالک کے بہت سے باشندے اسرائیل کے خلاف کھڑے ہیں اور اپنی حکومتوں کے خلاف مظاہرے کر رہے ہیں۔ اپنی تاریخ میں آج پہلی دفعہ اسرائیل اکیلا کھڑا ہے۔ اس کے جھوٹوں کا گھڑا پھوٹ چکا ہے۔

(مضمون نگار کی مسئلہ فلسطین پر گہری نظر ہے۔ قاہرہ یونیورسٹی میں ان کا ام فل کا مقالہ فلسطینی مزاحمت کے بارے میں تھا۔ بیروت سے ان کی دو کتابیں عربی میں کی چھپی ہیں (التلمود: تاریخہ وتعالیمہ (۱۹۷۱ء) اور تاریخ فلسطین القدیم (۱۹۷۳ء)۔ اس کے علاوہ ان کی فلسطینی دستاویزات پر ایک ہزار صفحے پر مشتمل کتاب PalestineDocument دہلی سے ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی جو انگریزی میں ایسی واحد کتاب ہے۔)

تاریخ اسلام
از
مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

اول و دوم: اس کتاب کے حصہ اول میں عہد رسالت وخلافت راشدہ آغاز اسلام سے خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کا ذکر ہے۔ حصہ دوم میں بنی امیہ یعنی اموی حکومت کے صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

صفحات: ۶۹۰　　　قیمت: ۵۶۰/روپے

سوم و چہارم: اس کتاب کے حصہ سوم و چہارم میں ابوالعباس سفاح ۱۳۲ھ/۷۵۰ء سے ابواسحاق متقی باللہ ۳۳۳ھ/۹۴۴ء تک دو صدیوں کی تمدنی اور علمی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

صفحات: ۸۰۰　　　قیمت ۵۰۰/روپے

اخبار علمیہ

نئے دریافت شدہ سمندری کیڑے کا نام صدر مرمو کے نام پر رکھا گیا

زولوجیکل سروے آف انڈیا نے ایک ڈھال نما سر والے، سرخ چمک دار سمندری کیڑے کا انکشاف کیا ہے جو پودوں کی ہلاکت کا سبب بنتا ہے۔ میلانوکلیمس جینس سے نسلی تعلق رکھنے والا یہ کیڑا مغربی بنگال کے ڈیگھا اور اڈیشہ کے اودے پور ساحل پر ملا۔ اس کی یہ نئی قسم دنیا میں کہیں اور نہیں پائی جاتی۔ اس کا نام صدر جمہوریہ کے نام پر میلانوکلیمس دروپدی (Melnochlamys droupadi) رکھا گیا ہے۔ زیڈ، آئی، ایس کے سربراہ دھیرتی بنرجی نے کہا کہ اس کی نوعیت کی تصدیق مورفولوجیکل (علم الاشکال)، جسمانی اور سالماتی خصوصیات کی جانچ پڑتال کے بعد ہوئی ہے۔ اس کی لمبائی زیادہ سے زیادہ ۷ ملی میٹر ہے۔ ساحل پر اس کے رینگنے کے نشانات ہیں۔ اس کی افزائش نومبر اور جنوری کے مہینے میں ہوتی ہے۔ اس کے علاقہ کو اولڈ ڈیگھا کا نام دیا گیا ہے جو ڈیگھا سے ۵۰ میٹر کے فاصلہ پر ہے۔ زیڈ، آئی، ایس کے محققین کی طرف سے ایک مقالہ میں کہا گیا ہے کہ زندہ میلانوکلیمس دروپدی جانور مسلسل ایک خفیہ خلیے سے منتقل ہوتے ہیں اور شاذونادر ہی دکھائی دیتے ہیں۔

(روزنامہ دی ہندو، لکھنؤ، ۱؍مارچ ۲۰۲۴ء ص ۴)

ایک خطرناک سیارچہ زمین کے قریب آرہا ہے

ناسا نے فٹ بال میدان کے برابر ایک خطرناک سیارچہ کی اولین تصویروں کی تفصیلات شائع کی ہیں جو زمین کے قریب آیا تھا۔ کیٹا لینا اسکائی سروے نے ۲۰۰۸ء میں اس کو دریافت کیا تھا اور اس کو OS7 2008 کا نام دیا گیا تھا مگر دوری کی وجہ سے اس کی تفصیلی تصاویر لینا اس وقت ممکن نہیں تھا۔ ۲؍فروری کو سیارچہ زمین سے قریب تین ملین کلومیٹر کے فاصلہ سے گزرا۔ یہ فاصلہ زمین اور چاند کے درمیان فاصلہ سے سات گنا زیادہ ہے۔ اس سے ماہرین فلکیات کو اس آہستہ آہستہ گھومنے والی خلائی چٹان کی جامع تصاویر نکالنے کا موقع ملا۔ دوری کی وجہ سے اگرچہ OS7 2008 زمین کے لیے خطرہ نہیں ہے لیکن اس کو ممکنہ طور پر خطرناک سیارچوں کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ۲ فروری کو یہ سیارچہ زمین سے جتنے قریب سے گذرا ہے اس سے زیادہ قریب زمین کے مدار تک کوئی سیارچہ کم از کم دوسو برسوں میں نہیں پہنچ سکا تھا۔ (صحیفۃ الوطن، بحرین ۱؍مارچ ۲۰۲۴ء ص ۱۶)

ک، ص اصلاحی

وفیات

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

خالد ندیم

dr.khalidnadeem@gmail.com

جامع مسجد منصورہ (لاہور) میں نماز جمعہ کے لیے لوگوں کی بھیڑ ویسے ہی دیدنی ہوتی ہے، لیکن ۲۶ رجنوری ۲۰۲۴ء کو نماز جمعہ کے لیے مسجد کا اندرون، وسیع وعریض صحن اور ارد گرد کی سڑکیں لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ایک گوشہ نشین، درویش صفت اور دیر پیوند انسان کے نماز جنازہ میں شرکت کرنے والوں کا دائرہ مذہبی، تدریسی، علمی، ادبی، کاروباری، سماجی اور سیاسی شعبوں تک پھیلا ہوا تھا، کسی کے وہم و گمان میں نہیں تھا۔ ۲۵رجنوری ۲۰۲۴ء کی شام بعد از نماز عصر، استاذ الاساتذہ، سفرنامہ نگار، نقاد، محقق اور اقبال شناس پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ہفتہ بھر کی علالت کے بعد دار فانی سے کوچ کر گئے۔

نبی کریمؐ کے چچا حضرت عباس کے اخلاف میں سے کچھ لوگوں نے ایک زمانے میں حجاز سے ہجرت کی اور نہیں معلوم، کہاں کہاں اور کس کس دیار سے ہوتے ہوئے برعظیم کے شہر سیال کوٹ میں وارد ہوئے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ تھے: خدا بخش (ولد نور عالم)، جو سلسلہ نقشبندیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنے مرشد حضرت اخوند ترابؒ (مقیم پشاور) کے ارشاد کی تعمیل میں، نقل مکانی کر کے تلہ گنگ کے شمال مغرب میں واقع مصریال نامی گاؤں میں آ کر بس گئے۔ یہاں وہ کئی برس تک اشاعت دین میں مصروف رہے، پھر مرشد نے انھیں چشمہ بیراج سے چند کلومیٹر دور پہاڑوں کے درمیان واقع عمر خیل نامی علاقے میں تبلیغ دین کی ذمہ داری تفویض کی، چنانچہ وہ اپنے بڑے بیٹے عطا رسول سمیت، خاندان کے سب لوگوں کو یہیں چھوڑ کر خود عمر خیل کی طرف کوچ کر گئے۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کا شجرہ نسب انھیں عطا رسول سے جا ملتا ہے۔ ہاشمی صاحب کے پاس موجود شجرۂ نسب کے مطابق پچاسویں پشت میں ان کا سلسلہ حضرت عباس بن عبدالمطلب بن ہاشم تک پہنچتا ہے، اسی

نسبت سے وہ ہاشمی کہلاتے ہیں۔

مصریال میں ان کے بزرگوں کا پیشہ کاشت کاری تھا، تاہم ان کی دینداری اور نیک خوئی کے باعث عوام الناس انہیں پیر و مرشد کا درجہ دیتے تھے، چنانچہ آج بھی مصریال اور اردگرد کے علاقوں میں ان کے مریدوں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ اس خاندان میں علمی روایت بھی موجود رہی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک ان کے ہاں فارسی کے بعض قلمی نسخوں، سکندر ناموں، اسپ ناموں اور اسی طرز کے بعض دوسرے مخطوطات کی موجودگی کا پتا چلتا ہے، مگر ان میں سے بیشتر مرورِ زمانہ کی نذر ہو گئے، تاہم ان کے بعض عزیزوں کے ہاں کچھ مخطوطات اب بھی موجود ہیں۔

پروفیسر رفیع الدین کے دادا عالم شاہ (م: ۱۹۶۹ء) کھیتی باڑی کرتے تھے، زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے، مگر بہت نیک اور پارسا انسان تھے۔ دینی قدروں اور شعائر کا خاص خیال رکھتے تھے۔ علماء کے قدردان تھے۔ آخری عمر میں انہیں دینی کتب کے مطالعے سے زیادہ رغبت ہوگئی تھی۔ چاہتے تھے کہ ان کے بیٹے بھی (بجائے کسان) عالم دین بنیں۔ چنانچہ دونوں بیٹوں (محمد محبوب شاہ ہاشمی اور عبدالرحمٰن ہاشمی) کو انھوں نے کاشت کاری کی تمام ذمہ داریوں سے سبک دوش کرتے ہوئے تعلیم کے حصول کے لیے وقف کر دیا۔ یہ دونوں پہلے قریبی قصبے سگھر کے پرائمری اسکول میں زیر تعلیم رہے، پھر کچھ وقت قریبی قصبے ٹمن کے دینی مدرسے میں گزارا اور بعد ازاں پنجاب سے آگے دہلی اور اتر پردیش کا رخ کیا۔ عبدالرحمٰن زیادہ تر دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم رہے، مگر درس نظامی کی تکمیل ڈابھیل (ضلع سورت) میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی زیرنگرانی ہوئی۔ دینی تعلیم کے بعد انھوں نے خانیوال جا کر طب یونانی کی تعلیم مکمل کی اور ۱۹۴۱ء میں وہ سرگودھا کے قریب واقع موضع لڈے والا میں بطور طبیب پریکٹس کرنے گئے۔ اس کے ساتھ وہ گاؤں کی مسجد میں درس قرآن بھی دیتے تھے۔ وہ پیش امام تو نہ تھے، البتہ کبھی کبھی نماز بھی پڑھاتے تھے۔ بڑے بھائی محبوب شاہ ہاشمی مظاہر العلوم سہارنپور اور دارالعلوم فتح پوری مسجد دہلی میں زیر تعلیم رہے، مگر اپنی سیمابی طبیعت کے باعث درس نظامی کی تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ وہ حکیم صاحب کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ ایک طرف تو وہ دوا سازی میں اپنے چھوٹے بھائی حکیم عبد الرحمٰن ہاشمی کا ہاتھ بٹاتے اور دوسری جانب کچھ وقت دعوت اسلامی کے کام میں صرف کرتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کئی بار سائیکل پر میانوالی، سرگودھا، لائل پور (حال: فیصل آباد) لاہور اور جماپور

(پٹھان کوٹ) میں واقع جماعت اسلامی کے مرکز تک سفر کیے۔ انھیں سید ابوالاعلیٰ مودودی سے بہت عقیدت تھی۔ وہ مہم جو قسم کے شخص تھے۔

بعدازاں دونوں بھائی اپنے والد کو مصریال سے لڈے والا لے آئے۔ یہاں آ کر عالم شاہ بچوں کو مسجد میں قرآن حکیم پڑھانے لگے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ خاندان گاؤں سے سرگودھا منتقل ہو گیا۔

رفیع الدین ہاشمی ۱۰ر فروری ۱۹۴۰ء کو مصریال میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں وہ اپنی والدہ کی شفقت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔ بچپن کا کچھ عرصہ مصریال میں اور باقی لڈے والا میں گزرا۔ حفظِ قرآن کے بعد انہوں نے ۱۹۵۳ء میں پرائمری جماعتوں کا مرحلہ کامیابی سے طے کر لیا۔ اس کے بعد وہ انبالہ مسلم ہائی اسکول سرگودھا میں داخل ہو گئے۔ اسکول کی تعلیم کے ساتھ ان کے چچا عبدالرحمٰن ہاشمی نے انہیں عربی گرامر اور فارسی کی بعض ابتدائی کتب (کریما، نامِ حق، پند نامہ، عطار اور گلستان و بوستان) بھی پڑھا دیں۔

ہاشمی صاحب انبالہ مسلم ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مولوی فتح الدین کا نام بڑے ادب اور احترام سے لیتے تھے۔ کہتے تھے کہ مولوی صاحب سرسید کی ہو بہو تصویر تھے۔ نویں جماعت میں سائنس یا اردو میں سے ایک مضمون کا انتخاب کرنا پڑتا تھا وہ سائنس کا مضمون پڑھنا چاہتے تھے، لیکن ریاضی کے ایک استاد صولت صاحب نے (اپنے تئیں بڑے خلوص سے) طلبہ کو سائنس کے مضمون کی مشکلات سے اتنا ڈرایا کہ وہ سائنس سے خوفزدہ ہو گئے۔ نتیجۃً کئی طلبہ کی طرح ہاشمی صاحب نے بھی اردو کا مضمون اختیار کر لیا۔ حافظ محمود شیرانی کی مرتبہ ''سرمایہ اردو'' بطور نصابی کتاب پڑھائی جاتی تھی۔ ہاشمی صاحب نے اسی اسکول سے ۱۹۵۷ء میں میٹرک کے امتحان میں درجہ اول کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔

اسکول کے زمانۂ طالب علمی میں ہاشمی صاحب معلومات عامہ کے مقابلوں میں بھی حصہ لیتے تھے، چنانچہ انہوں نے چند ایک انعامات بھی حاصل کیے۔ اسی زمانے میں بچوں کے رسائل کے مطالعے کا شوق بھی پیدا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے خاندان میں دینی اعتبار سے پڑھنے لکھنے کی فضا موجود تھی اور گھر میں بعض دینی رسالے باقاعدگی سے آتے تھے۔ والد نے کئی بار مکتبہ جامعہ دہلی کی شائع کردہ بچوں کی کتابیں لا کر دیں۔ بچوں کا رسالہ ''نور'' رام پور لگوایا ہوا تھا، جب کہ دہلی کا ''کھلونا'' اور بعض دیگر رسالے وہ اِدھر اُدھر سے لے کر پڑھ لیتے تھے۔ ساتویں یا آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے کہ

''گلستان سعدی'' کی ایک حکایت کی بنیاد پر ایک مختصر سی کہانی لکھی جو ماہ نامہ ''نور'' میں شائع ہوئی۔ ایک مرتبہ ادارہ الحسنات رامپور نے مضمون نویسی کا انعامی مقابلہ کرایا تو ہاشمی صاحب نے بھی انعام حاصل کیا۔ اسی عرصے میں ان کے والد نے انھیں ''بانگ درا'' کا نسخہ لا کر دیا، جس میں سے بعض نظمیں انھیں یاد ہو گئیں۔

سنہ ۱۹۵۷ء میں انٹرمیڈیٹ کے لیے گورنمنٹ کالج سرگودھا میں داخل ہوئے۔ عربی مولانا عبدالحی اور شیر محمد زمان (ڈاکٹر ایس ایم زمان)، معاشیات ملک جہانگیر اور انگریزی غلام جیلانی اصغر اور مختار محمود سے پڑھی۔ ہاشمی صاحب کہتے ہیں کہ انہوں نے ڈاکٹر ایس ایم زمان صاحب اور مختار محمود صاحب سے زیادہ اثرات قبول کیے۔ کالج کے پرنسپل، عربی زبان و ادب کے فاضل، ڈاکٹر عابد احمد علی صاحب کے وہ مداح ہیں، جو سر سید احمد خاں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ علی گڑھ اور آکسفرڈ کے تعلیم یافتہ تھے۔ نہایت شفیق، ہمدرد اور مثالی منتظم تھے۔ پروفیسر مرزا ریاض نے کالج میں حلقۂ ادب قائم کیا۔ نماز جمعہ کے بعد اسٹاف روم میں حلقے کے ہفتہ وار تنقیدی اجلاس ہوتے تھے۔ ان میں ادب سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ کے علاوہ متذکرہ بالا اساتذہ اور ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سہیل بخاری، صاحب زادہ عبد الرسول اور پروفیسر خلیل بدایونی بھی شریک ہوتے تھے۔ ہاشمی صاحب کہتے ہیں کہ ادب و تنقید کا ابتدائی ذوق و شعور مجھے انہی اجلاسوں سے ملا۔ اس ماحول میں انہوں نے شاعری بھی کی اور افسانہ نگاری بھی۔ کالج اسٹوڈنس یونین میں سال دوم کے نمائیدہ اوّل کے طور پر شامل رہے۔ ۱۹۶۰ء میں انہوں نے ایف اے کا امتحان دیا اور وظیفے کے ساتھ درجہ اوّل حاصل کیا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تصانیف کا مطالعہ انہوں نے اسی دور میں کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، پریم چند اور نسیم حجازی کے ناول اور علی عباس حسینی، کوثر چاند پوری، کرشن چندر، غلام عباس، منٹو، بیدی، رئیس احمد جعفری، سید اسعد گیلانی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، انتظار حسین کے افسانے کچھ تو اسی عرصے میں اور کچھ بی اے کے زمانے میں پڑھے۔

ایف اے کے بعد، وہ صحت کی خرابی کی بنا پر باقاعدہ تعلیم جاری نہ رکھ سکے، چنانچہ انہوں نے ۱۹۶۳ء میں پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اس زمانے میں ''نوائے وقت''، ''لیل و نہار''، ''قندیل''، ''سیارہ''، ''اقدام''، ''ایشیا'' اور دیگر پرچوں میں ان کی شاعری افسانے،

انشائیے اور طنزیہ ومزاحیہ مضامین شائع ہونے لگے تھے۔ ان دنوں انہیں پہلی بار سوات کی سیاحت کا موقع ملا تو انہوں نے ’ایک سفر کی کہانی‘ کے نام سے اس سفر کی رُوداد لکھی، جو ہفت روزہ ’’ایشیا‘‘ میں چھ اقساط میں شائع ہوئی۔ بی اے کے زمانے میں بھی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تصانیف ان کے زیر مطالعہ رہیں۔

گورنمنٹ کالج سرگودھا میں ایم اے کی کلاسیں جاری ہو چکی تھیں۔ وہ اسی کالج میں ایم اے اردو کی کلاس میں داخل ہو گئے۔ ملک زری بند، ملک عبدالغنی اور رحمت علی مسلم ان کے اساتذہ میں شامل تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ پڑھائی میں کچھ لطف نہیں آ رہا تھا۔ مجھے مطالعے کا بہت شوق تھا اور میں نے سید وقار عظیم، ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر وحید قریشی جیسے نامور حضرات کی بہت سی چیزیں پڑھ رکھی تھیں۔ جب اپنے اساتذہ کے لیکچر سنتا تو مجھے یاد آتا کہ یہ باتیں تو میں پڑھ چکا ہوں اور مضطرب ہوتا۔ جی چاہتا کہ اورینٹل کالج جا کر براہ راست اساتذہ سے پڑھا جائے۔ گھریلو حالات سازگار نہ تھے، لیکن ایک بہتر معیار پر پڑھائی کا شوق روز افزوں ہوتا گیا۔

ہاشمی صاحب بتاتے ہیں کہ انہوں نے گھر والوں سے اصرار کر کے اپریل ۱۹۶۵ء میں مائیگریشن کروالی اور اورینٹل کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔ چند ہفتوں بعد سال اوّل کا سالانہ امتحان منعقد ہوا۔ انہوں نے اپنی محنت اور مطالعے کی بدولت نمایاں کامیابی حاصل کی، سو سے زائد طلبہ وطالبات میں ان کی دسویں پوزیشن تھی۔ حسب ضابطہ اوپر کے دس طلبہ کو مقالہ لکھنے کی اجازت ملتی تھی۔ ہاشمی صاحب کو بھی اجازت ملی، مگر انہوں نے وقت کی کمی اور مقالہ تیار اور ٹائپ کرانے کے متوقع اخراجات کے پیش نظر مقالہ لکھنے سے معذوری ظاہر کر دی، جس پر تمام اساتذہ کو تعجب بھی ہوا، کیونکہ طلبہ کو مقالہ لکھنے کی اجازت ملے تو شاذ ہی کوئی انکار کرتا ہے۔ بہرحال، مقالہ نہ لکھنے کے باوجود وہ ایم اے میں اوّل بدرجہ اوّل کامیاب ہوئے اور یونیورسٹی گولڈ میڈل حاصل کیا۔ پہلی پوزیشن کی وجہ سے انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) کی طرف سے بھی انہیں ’’تمغۂ بابائے اردو‘‘ عطا کیا گیا۔

اورینٹل کالج کے زمانۂ طالب علمی کی ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ یونیورسٹی میگزین بورڈ کے صدر اور رسالہ ’’محور‘‘ کے چیف اڈیٹر مقرر رہوئے۔ مدیران میں عطاء الحق قاسمی اور عبدالغنی فاروق شامل تھے۔ بورڈ اور ’’محور‘‘ کے نگران پروفیسر سید وقار عظیم تھے۔ ہاشمی صاحب اس دور کی ایک اور اہم بات یہ

بتاتے ہیں کہ شعبۂ اردو کے زیر اہتمام، خواجہ محمد زکریا کی زیر صدارت ایک سیمینار میں انہوں نے ترقی پسند تحریک کے موضوع پر ایک مقالہ پیش کیا، جسے سننے کے لیے ایف سی کالج سے پروفیسر اقبال احمد خاں خاص طور پر تشریف لائے اور اسے بے حد پسند کیا۔

اورینٹل کالج میں ان کے اساتذہ میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، پروفیسر سید وقار عظیم، ڈاکٹر ناظر حسین زیدی، پروفیسر خواجہ محمد سعید (گورنمنٹ کالج لاہور)، ڈاکٹر اقبال احمد خاں (ایف سی کالج لاہور)، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا شامل تھے۔

ہاشمی صاحب کی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا۔ زمانۂ طالب علمی ہی میں صحافت سے ان کا ایک تعلق قائم ہو گیا تھا۔ وہ مختلف اخبارات و رسائل میں مضمون نگاری کر کے تعلیمی اخراجات پورے کرتے تھے۔ اسی دوران مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور بعض دیگر قومی اور سیاسی مشاہیر (خواجہ رفیق شہید، پروفیسر حمید احمد خاں، نواب زادہ نصراللہ خاں، اے کے بروہی وغیرہ) کی تقاریر کی رپورٹنگ اور ان کی گفتگوئیں قلم بند کرنے کی ذمہ داری بھی ادا کی۔ یوں ڈاکٹر ہاشمی کو مولانا کی شخصیت اور فروغ دین اور اصلاح ملک وملت کے سلسلے میں ان کی دینی و سیاسی جدوجہد کو سمجھنے کا اچھا موقع میسر آیا۔ ایم اے اردو کے بعد، پروفیسر سید وقار عظیم کے توسط سے انہیں روزنامہ ''مشرق'' لاہور سے بطور معاون مدیر وابستہ ہو کر عامل صحافی بننے کا ایک موقع بھی ملا، لیکن اسی دوران غزالی کالج جھنگ میں ان کو لکچرار اردو کی پیش کش ہوئی۔ انہوں نے معلّمی کو صحافت پر ترجیح دی کیونکہ ان کے خیال میں علمی اور تحقیقی کام تدریسی شعبے سے وابستہ ہو کر بہتر طور پر ہو سکتا تھا۔ وہ ایک تعلیمی سیشن (۱۹۶۶ء- ۱۹۶۷ء) غزالی کالج جھنگ سے وابستہ رہے، پھر کچھ عرصہ کے لئے میونسپل ڈگری کالج چشتیاں اور بعد ازاں ایف سی کالج لاہور میں اردو کے لیکچرر رہے۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد سے نئی سرکاری ملازمتوں پر پابندی خاصے عرصے تک برقرار رہی، چنانچہ انہوں نے کچھ مدت ماہنامہ ''سیارہ'' اور ''اردو ڈائجسٹ'' میں معاون مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ جنوری ۱۹۶۹ء میں بطور لیکچرر انبالہ مسلم کالج سرگودھا میں تعینات ہو گئے۔ اس دوران اکتوبر ۱۹۶۹ء میں ڈاکٹر ہاشمی رشتہ ازدواج سے منسلک ہو گئے۔ جون ۱۹۷۰ء میں پبلک سروس کمیشن سے لیکچرر منتخب ہوئے۔ پہلا تقرر گورنمنٹ کالج مری میں ہوا۔ تقریباً سوا سال بعد ان کا تبادلہ گورنمنٹ کالج سرگودھا ہو

گیا۔ یہاں کے نو سالہ زمانۂ معلّمی کے دوران انہوں نے کئی علمی منصوبے مکمل کیے۔

''اقبال کی طویل نظمیں'' کے نام سے ان کی پہلی اقبالیاتی تصنیف، جسے وہ ۱۹۷۱ء میں مکمل کر چکے تھے، تین برس بعد چھپ کر ۱۹۷۴ء میں منظر عام پر آئی۔ ان کی دو تالیفات سرور اور فسانہ عجائب (۱۹۷۵ء) اور اصناف ادب (۱۹۶۷ء) چھپیں تو ثانوی تعلیمی بورڈ سرگودھا کی طرف سے ان پر انعام دیا گیا۔ اقبالیات کے حوالے سے اس عرصے میں ان کی متعدد کتب منصۂ شہود پر آئیں، جن میں کتب اقبالیات (۱۹۷۵ء) اور خطوطِ اقبال (۱۹۷۶ء) شامل ہیں۔ اسی دوران صد سالہ تقریبات ولادت علامہ محمد اقبال کے سلسلے میں اقبال اکادمی پاکستان کے لیے کتابیات اقبال (۱۹۷۷ء) مرتب کی اور مجلس ترقی ادب کی فرمائش پر ''اقبال بحیثیت شاعر'' (۱۹۷۶ء) کے نام سے مضامین کا ایک مجموعہ ترتیب دیا۔ کتابیات اقبال کو ثانوی تعلیمی بورڈ سرگودھا نے سال اقبال کی بہترین تالیف کے طور پر اوّل انعام کا مستحق قرار دیا۔

گورنمنٹ کالج سرگودھا کی ملازمت کے دوران ہی ڈاکٹر ہاشمی کی لیاقت کو تسلیم کرلیا گیا تھا، چنانچہ انہیں یہ اعزاز حاصل ہوا کہ ایک تو انہیں سرکاری سطح پر لاہور میں منعقدہ پہلی عالمی اقبال کانگریس (۲-۹ نومبر ۱۹۷۷ء) میں بطور مندوب و مقالہ نگار شرکت کے لیے مدعو کیا گیا۔ دوسرے انہیں کانگریس کی نمائش کتبِ کمیٹی کا رکن بھی مقرر کیا گیا۔ یہ اعزاز اس لیے اہم ہے کہ بیرون لاہور کسی کالج سے انٹرنیشنل کانفرنس میں مدعو ہونے والے وہ واحد مندوب تھے۔ متصل زمانے میں انہوں نے لاہور میں منعقدہ علامہ اقبال اردو کانفرنس (نومبر ۱۹۷۷ء) اور جہاں زیب کالج سیدو شریف میں منعقدہ قومی تعلیمی کانفرنس (۲۷-۲۹/ جولائی ۱۹۷۸ء) میں بھی بطور مندوب اور مقالہ نگار شرکت کی۔

گورنمنٹ کالج سرگودھا کے دوران قیام پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج سے پی ایچ ڈی کے لیے ان کا رجسٹریشن ہو گیا اور ڈاکٹر وحید قریشی کی زیرِ نگرانی انہوں نے ''تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ'' کے عنوان سے اپنا مقالہ مکمل کر کے ۱۹۸۲ء میں ڈگری حاصل کی۔ اس دوران گورنمنٹ کالج لاہور میں ان کا تبادلہ ہو گیا۔ جہاں وہ پونے دو سال تک درس و تدریس کرتے رہے۔

۹/ ستمبر ۱۹۸۲ء کو وہ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے شعبہ اردو سے منسلک ہو گئے اور لیکچرر، اسسٹنٹ پروفیسر، ایسوسی ایٹ پروفیسر، پروفیسر اور صدر شعبہ کے مناصب پر فائز رہنے کے بعد ۱۳ مارچ ۲۰۰۲ء کو اسی جامعہ سے سبکدوش ہوئے، البتہ شعبہ اردو نے مزید دو سال کے لیے مہمان پروفیسر

کی حیثیت سے ان کی خدمات سے استفادہ کیا۔

اورینٹل کالج کا عرصہ ڈاکٹر ہاشمی کے صلاحیتوں کے بھرپور اظہار کا دورانیہ کہا جا سکتا ہے۔ تدریسی فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ انہوں نے کئی غیر ملکی سفر کیے اور متعدد ملکی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ ۱۹۸۹ء میں انھیں فریضۂ حج ادا کرنے اور روضۂ رسول پر حاضری دینے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ ۲۰۰۲ء میں دائتوبنکا یونیورسٹی جاپان کی دعوت پر انہوں نے ایک ماہ کے لیے جاپان کا مطالعاتی دورہ کیا۔ اس مدت میں انہوں نے تصنیف و تالیف کا کام برابر جاری رکھا اور تحقیقی مقالات کی نگرانی بھی کرتے رہے۔ اورینٹل کالج میں پی ایچ ڈی کے گیارہ اور ایم اے اردو کے سینتالیس مقالات ان کی نگرانی میں پایۂ تکمیل کو پہنچے، جب کہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے لیے انہوں نے پی ایچ ڈی (اردو) کے ایک، ایم فل (اردو) کے پانچ، پی ایچ ڈی (اقبالیات) کے ایک اور ایم فل (اقبالیات) کے پندرہ مقالات کی نگرانی کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر ہاشمی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کی نگرانی میں مکمل ہونے والے متعدد مقالات زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ ان کی عمدہ تحقیق اور تدریسی کارکردگی کی بنا پر ۲۰۰۱ء میں انھیں ہائر ایجوکیشن کمیشن کی طرف سے ''بیسٹ یونیورسٹی ٹیچر'' کا ایوارڈ دیا گیا۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہ تین سال تک ادارہ معارف اسلامی لاہور سے بطور ریسرچ ڈائریکٹر وابستہ رہے۔ پھر دو سال (۲۰۰۶ء-۲۰۰۸ء) بطور ایچ ای سی ایمی نںٹ اسکالر یونیورسٹی کے شعبہ اقبالیات میں تحقیقی کام کرتے رہے۔ ۳۱ ؍مارچ ۲۰۰۲ء، کو جب وہ یونیورسٹی کی مدت ملازمت پوری کرنے پر سبکدوش ہوئے تو متعدد تحقیقی مقالے ان کی نگرانی میں زیر تحقیق تھے، چنانچہ سبکدوشی کے بعد بھی انہوں نے پی ایچ ڈی کے سات اور ایم فل کے متعدد مقالات مکمل کرائے۔ اپنی متعدد زیر تصنیف کتابوں اور تحقیقی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ بہت سے تحقیقی مقالے، تبصراتی مضامین، تبصرے اور دیباچے لکھے، جن کی تعداد ایک سو سے متجاوز ہوگی۔ اکتوبر ۲۰۰۸ء کے بعد سے شعبۂ اردو یا پنجاب یونیورسٹی سے ان کا کچھ تعلق نہ رہا، اس کے باوجود انہوں نے صدر شعبہ اردو کی فرمائش پر اپنے استاد اور شعبے کے ایک مرحوم استاد کی یاد میں ''ارمغان افتخار اللہ صدیقی'' مرتب کیا۔ گرتی ہوئی صحت اور مختلف عوارض کے باوجود، ملازمت کے بعد کا عشرہ ان کے لیے اس اعتبار سے بہت بابرکت ثابت ہوا کہ اس دوران میں ان کی گیارہ تصانیف و تالیفات منظر عام پر آئیں۔

ایک مثالی استاد کی حیثیت سے ان کی منفرد شناخت ہمیشہ برقرار رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ استاد کی ذمہ داریوں کا انہیں بھرپور احساس رہا ہے۔ ایک موقعے پر انہوں نے کہا کہ ایک اچھے استاد کو شعوری طور پر احساس ہو کہ اس کا پیشہ دوسروں سے مختلف ہے، لہذا اس کی زندگی حقیقی معنوں میں معلم کی زندگی ہو۔ وہ اصولوں، ضابطوں اور اقدار کا پابند ہو۔ باطل، شر، نمود و نمائش، شہرت، جاہ طلبی اور زر پرستی سے اسے کوئی تعلق نہ ہو۔ اپنے تلامذہ کے حق میں ہمدرد، مخلص اور شفقت و محبت کا پیکر ہو اور اسے ہر دم فکر لاحق ہو کہ وہ اپنے شاگردوں کو اچھا انسان کیسے بنا سکتا ہے[۱]۔ چنانچہ ان کے تمام شاگرد اس بات کے شاہد ہیں کہ ڈاکٹر ہاشمی اپنے شاگردوں اور وابستگان کو کسی نہ کسی علمی منصوبے کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ محض ترغیب ہی نہیں دیتے، بلکہ اکثر اوقات لوازمے کی نشان دہی کرنے کے ساتھ، اگر ان کے پاس کسی طرح کا لوازمہ میسر ہوتا تو فراخ دلی سے اس کی فراہمی کا بندوبست بھی کرتے ہیں۔ اس نیکی میں وہ اپنی سیکڑوں کتابوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ اگر کوئی ان کے تجویز کردہ کسی علمی منصوبے پر عمل شروع کر دے تو وقتاً فوقتاً اس سے استفسار بھی کرتے رہتے۔ ان کا تعاقب بھی کرتے رہتے اور جب کوئی منصوبہ مکمل ہو جاتا ہے تو کتابت، پروف خوانی اور پھر طباعت و اشاعت کے تمام مراحل میں اس کی رہنمائی کرتے۔ اس ضمن میں دوستوں، شاگردوں، وابستگان اور اجنبیوں کی کوئی قید نہیں، بس کام کی نوعیت علمی ہو تو ڈاکٹر صاحب ہمہ وقت، ہمہ جہت سرپرستی اور تعاون کے لیے تیار رہتے۔ ''اقبال یورپ میں'' کے مصنف ڈاکٹر سعید اختر درانی کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا سپاس گزار ہوں کہ نہ صرف اس کتاب کی تدوین و ترتیب کا اولین مشورہ انہیں نے دیا تھا، بلکہ ۱۹۸۱ء کے بعد تقریباً ہر خط اور میرے پاکستان کے دوروں کے دوران ہر ملاقات میں انہوں نے مجھ پر زور دیا کہ میں کتاب کے باقی ماندہ حصوں کو جلد از جلد مکمل کروں۔ میں نے انہیں اپنے مسودوں کی کانٹ چھانٹ اور ترتیب و تہذیب کی مختلف ادارتی ذمہ داریاں تفویض کر رکھی تھیں اور یہ انہوں نے مہارت اور جاں فشانی کے ساتھ سرانجام دیں[۲]۔

۱۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی: انٹرویو مشمولہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بحیثیت معلم، مقالہ برائے بی ایڈ (۲۰۰۴ء - ۲۰۰۵ء) نگار: حمیرا مجید + روبیلہ منور، نگرانِ مقالہ: ڈاکٹر عبدالکریم خالد، ص ۳۰۔ غیر مطبوعہ، مخزونہ ایجوکیشن یونیورسٹی، لاہور۔

۲۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی: اقبال یورپ میں، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۵۷۔

درّانی صاحب نے اپنی دوسری کتاب ''نوادرِ اقبال یورپ میں'' کے اندر بھی اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ان کی دونوں کتابوں کا انتساب ہاشمی صاحب کے نام ہے۔

ہاشمی صاحب کے طریق کار کے مطابق تحقیقی امور انجام دینا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ یہ اعتراف ضروری ہے کہ میرے پی ایچ ڈی کے مقالے کی نگرانی کے دوران، ان کی مزاج کی نرمی اور مقالے کے معیار کو برقرار رکھنے کے لیے ان کی کاوشوں نے مجھے الجھنے اور بھٹکنے سے بچالیا۔ اقبال نے شاید ایسے ہی میر کارواں استاد کے بارے میں کہا تھا: نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز وقت اور لفظ کا جتنا اچھا استعمال ڈاکٹر ہاشمی کرتے تھے، ہمارے ہاں اکثر لوگوں کو اس کا ادراک بھی نہیں۔ وہ وقت کے مختلف ٹکڑوں، اجزا اور حصوں کو جوڑ کر کام کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ ایک مرتبہ کچھ بیمار پڑ گئے تو صاحب زادے انھیں ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے ڈرپ لگادی۔ یہ تھوڑی دیر تو اطمینان سے لیٹے رہے، پھر واسکٹ کی جیب سے چند کاغذات نکالے اور پروف پڑھنے لگے۔ بیٹے نے کہا: ابا جان! ذرا آرام کر لیتے۔ کہنے لگے بیٹا! بیکار پڑے رہنے سے یہ بہتر ہے، کچھ کام بھی ہو جائے گا۔ دوران سفر وہ اونگھنے اور کوئی ہمراہ ہو تو اس سے گفتگو کے ساتھ ساتھ وقت کا کچھ حصہ، تحریر و تصنیف یا اپنے مسودات کی نوک پلک درست کرنے یا ہلکا پھلکا مطالعہ کرنے میں صرف کرتے تھے۔

ان کی خوراک نہایت سادہ اور کم تھی۔ تقریبات میں شمولیت سے انہیں رغبت نہیں تھی۔ مہمان نواز تھے، لیکن تعلقات کے قائل نہیں۔ لباس ہمیشہ سادہ ہوتا تھا، یعنی شلوار قمیص، واسکٹ یا کوٹ اور جناح کیپ، البتہ لیکچرر شپ کے زمانے تک کوٹ پتلون پہنتے اور ٹائی بھی لگاتے تھے اور کبھی کبھی شیروانی بھی پہنتے تھے۔

عجز و انکسار ڈاکٹر ہاشمی کے مزاج کا بنیادی وصف تھا۔ ان کی سیرت کا یہ پہلو، ان کی گفتگو اور میل ملاقات کے علاوہ ان کی تحریروں سے بھی نمایاں ہوتا ہے۔ سبکدوشی کے بعد بھی کتنے برس تک اگر کسی شاگرد یا عزیز نے آگے بڑھ کر ان کا ہینڈ بیگ اٹھانا چاہا تو اسے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ میں اپنا بوجھ خود اٹھا سکتا ہوں۔ البتہ آخری برسوں میں مضمحل ہوتے قویٰ اور صحت کے مسائل نے انہیں مجبور کر دیا ہے کہ وہ شاگردوں کو بھی ہنڈ بیگ اٹھانے کی سعادت حاصل کرنے کا موقع دیں۔ احساس برتری انہیں چھو کر بھی نہیں گیا اور نہ انہیں اپنے مقام و مرتبے کا کبھی زعم ہوا ہے۔ وہ خاموشی اور استقامت سے اپنے کام

میں مگن رہتے اور کوئی دعویٰ نہیں کرتے تھے۔ خیر خواہوں کی خواہش کے باوجود، اپنی کسی کتاب کی تقریب رونمائی کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔ ہاں، اپنی ہر کتاب اپنے دوستوں اور بعض شاگردوں تک پہنچانے کی کوشش ضرور کرتے تھے۔ اس سے ایک طرف تو ان کا حلقۂ احباب ان کی علمی فتوحات سے آگاہ رہتا تھا اور استفادہ کرتا تھا، دوسری جانب اس سے انہیں علمی جستجو کی ترغیب بھی ملتی تھی۔

وہ اپنے شاگردوں کی ہمہ پہلو تربیت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ انہیں اپنے شب و روز کے نظام الاوقات کو مرتب کرنے اور وقت کے بہترین مصرف کی طرف توجہ دلاتے رہتے تھے۔ راقم ان کے چند ایسے شاگردوں کو جانتا ہے، جو کسی صورت پکڑائی نہیں دیتے تھے، لیکن یہ کبھی خط لکھتے ہیں، کبھی فون کرتے اور کبھی کتابیں یا ضروری کاغذات کے عکس روانہ کرتے، یہاں تک کہ ان کی صلاحیتوں کے مطابق، ان سے کام لینے میں کامیاب ہو جاتے۔ ایسی کتنی ہی تحریریں اور کتابیں میرے علم میں ہیں، جو محض ڈاکٹر ہاشمی کی مسلسل ترغیب و تشویق کے باعث معرض تحریر میں آئیں۔ راقم ان کے بعض ایسے شاگردوں سے بھی واقف ہے، جو محض ان کے تعاقب کی وجہ سے اپنے تعلیمی درجات میں ترقی پا گئے اور آج بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔

ڈاکٹر ہاشمی اپنے حلقۂ احباب کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے ہر ذریعہ استعمال کرتے تھے۔ اندرون و بیرون ملک پھیلے ہوئے اپنے دوستوں سے حتی الوسع رابطہ قائم رکھتے تھے۔ ای میل، فون پر یا بذریعہ خط ان کے بعض دوست بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق ان سے رابطہ رکھتے تھے۔ تعلقات میں یہ استقامت بہت کم لوگوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو سیر و سیاحت سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ میٹرک کے زمانہ طالب علمی کے دوران بھی، جب کبھی کوئی کلاس خالی ہوتی، وہ کلاس سے باہر نکل جاتے اور اسکول کے اندر گھومتے رہتے۔ ان کے اس طرز عمل پر بعض اساتذہ ناراضی کا اظہار بھی کرتے، لیکن ان سے مشاہدے کی یہ عادت نہ چھوٹ سکی۔ گورنمنٹ کالج مری میں ملازمت کے دوران وہ صبح سویرے ہوسٹل سے نکلتے اور اطراف و جوانب میں پھیلی ہوئی آبادیوں کو دیکھتے، پھر آبادیوں سے ذرا باہر دور چلے جاتے، جہاں وہ چیڑ اور دیودار کے اونچے اونچے درختوں پر اڑتے پھرتے اور چہچہاتے پرندوں کا مشاہدہ کرتے۔ کہیں کہیں جنگلی جانوروں کے اچھلنے کودنے، درختوں پر چھلانگیں لگانے، شاخوں سے لٹک جانے، کھانے کی چیزوں پر

ایک دوسرے پر غرّ انے اور چھینا جھپٹی جیسے نظاروں سے محظوظ ہوتے۔ یوں انہیں فطرت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

قدرت نے شاید ان کے اس شوق کے پیش نظر انہیں سیر وسفر اور سیاحت کے مواقع فراہم کیے۔ انہوں نے وطن عزیز کے بیش تر اہم سیاحتی مقامات اور شہروں کو دیکھا۔ حجاز مقدس کے چار اسفار کے علاوہ بھارت، فرانس، جرمنی، ترکی، بلجیم، جاپان، ہسپانیہ، ایران اور برطانیہ جانے اور کم وبیش مدت وہاں گزارنے کا موقع ملا، لیکن احوال سفر پر مشتمل باقاعدہ سفرنامے صرف دو ہی لکھ سکے۔

ڈاکٹر صاحب کو اپنے دوستوں اور بعض شاگردوں سے ملنے جلنے ان کے آنے اور ان کے ہاں جانے سے بھی مسرت کا احساس ہوتا تھا، لیکن دور کی اجتماعات اور تقریبات، خصوصاً وقت کو بیدردانہ ضائع کرنے والی (شادیوں اور ولیموں کی) تقریبات میں جانے سے حتی الوسع احتراز کرتے تھے، تاہم انسانی تعلقات برقرار رکھنے کی خاطر کبھی کبھار شرکت بھی کر لیتے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسے مواقع پر فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ البتہ اپنے ہم خیال اور ہم فکر احباب سے بالخصوص ایسے بزرگوں سے باقاعدگی سے ملنے جاتے جو گھر سے نہیں نکل سکتے۔ دیگر شہروں یا ملکوں سے لاہور آنے والے ان کے حلقۂ احباب میں شامل شاعر، ادیب، محقق، نقاد اور دانش وران سے ملنے ضرور آتے اور اگر ڈاکٹر صاحب کو کسی کی لاہور آمد کا علم ہو جائے تو انہیں فون کرتے اور حتی الوسع خود جا کر ان سے ملنے کی کوشش کرتے۔ ویسے ڈاکٹر صاحب طبعاً کم گو تھے اور کم گوئی ہی میں عافیت سمجھتے۔

ڈاکٹر ہاشمی سے متعلق ایک خوب صورت بات ان کے شاگرد اور رفیق کار ڈاکٹر زاہد منیر عامر نے لکھی ہے۔ قرآن کی ایک آیت میں سطح مرتفع پر واقع ایک باغ کی مثال دی گئی ہے، جس پر اگر موسلا دھار بارش ہو تو اس میں دوگنا پھل آتا ہے اور اگر معمولی بوندا باندی ہو تو وہ بھی کفایت کرتی ہے[۳]۔

زاہد صاحب اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی شخصیت بھی ایک ایسے ہی باغ کی طرح تھی۔ اگر آپ ان سے قریب ہیں تو یہ باغ آپ پر والہانہ ثمر نچھاور کرے گا اور اگر دور ہیں تو بھی اس کی خوش گوار ہوا کے جھونکے آپ تک پہنچتے رہیں گے[۴]۔

۳۔ سورۃ البقرۃ: ۲۶۴

۴۔ ڈاکٹر زاہد منیر عامر: انٹرویو مشمولہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بحیثیت معلم۔ محولہ بالا۔ ص ۶۲

بڑھتی عمر کے باوجود مطالعے اور تصنیف و تالیف سے ان کی لگن اور اپنے شاگردوں اور محققین سے ان کے تعاون کی فی زمانہ مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ اگرچہ وہ خود کو جاپان کے پروفیسر ہیروجی کتاؤ کا کی طرح دقیانوسی پروفیسر کہتے تھے [5]، مگر وہ رابطوں کے لیے خط نویسی کے ساتھ جدید ترین ذرائع اطلاعات و ابلاغ سے استفادے کے قائل تھے اور رابطے کا برقی ذریعہ بھی استعمال کرتے۔ ان کی صحت اگرچہ کبھی قابل رشک نہیں رہی، لیکن ان کے جذب دروں کی آنچ اردو زبان و ادب، خصوصاً اقبالیات کے لیے تقویت کا باعث رہی اور خلق خدا ان سے مستفید ہوتی رہی۔

راقم الحروف کو یہ شرف حاصل ہے کہ ۲۰۱۳ء میں اس نے استاد گرامی کی تدریسی، علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں ''ارمغان رفیع الدین ہاشمی'' مرتب کیا۔ اس مجموعے میں پاکستان سے پندرہ، بھارت سے پانچ، ایران، ترکی، دبئی اور جاپان سے ایک ایک مقالہ شامل ہے۔ ان مقالات میں سے سترہ کا تعلق اردو زبان سے ہے، تین تین فارسی اور انگریزی سے اور ایک کا ترکی سے، جب کہ ان مقالات میں عربی، جاپانی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں سے اقتباسات بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سے متعلق درج ذیل کتب شائع ہوچکی ہیں:

(۱) ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی: سوانح اور کتابیات۔ مرتبہ ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر

(۲) مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی۔ مرتبہ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

(۳) مکاتیب ابن فرید بنام رفیع الدین ہاشمی۔ مرتبہ خالد ندیم

(۴) اقبالیاتی مکاتیب بنام رفیع الدین ہاشمی۔ مرتبہ خالد ندیم

(۵) مکاتیب مختار الدین احمد بنام رفیع الدین ہاشمی۔ مرتبہ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

(۶) رفیع الدین ہاشمی، بنام گیان چند۔ مرتبہ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

(۷) مکاتیب رفیع الدین ہاشمی بنام ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر۔ مرتبہ ڈاکٹر ظفر حسین ظفر

(۸) مکاتیب آرزو بنام رفیع الدین ہاشمی۔ مرتبہ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

(۹) پروفیسر رفیع الدین ہاشمی: حیات اور ادبی خدمات۔ از ڈاکٹر ظہور احمد مخدومی

(۱۰) ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بحیثیت اقبال شناس۔ از ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

۵۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی: سورج کو ذرا دیکھ، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۸۷-۸۸

(۱۱) مکاتیب رفیع الدین ہاشمی بنام مشاہیر۔ مرتبہ ڈاکٹر زیب النساء

(۱۲) مکاتیب رفیع الدین ہاشمی بنام ڈاکٹر زیب النساء۔ مرتبہ ڈاکٹر زیب النساء

(۱۳) ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے تبصرے۔ مرتبہ ڈاکٹر زیب النساء

ڈاکٹر صاحب ''کتابیات اقبال'' کے پہلے ایڈیشن (۱۹۷۷ء) کے بعد اس میں مسلسل اضافے کرتے رہے، تا آنکہ ۲۰۲۳ء میں اقبال بین الاقوامی ادارہ برائے تحقیق و مکالمہ اسلام آباد کی طرف سے ۱۷۳۲ رصفحات پر مشتمل اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوگیا۔ اس نہایت ضخیم تالیف کی نہایت ہی عمدہ اشاعت پر ہاشمی صاحب بے حد مسرور تھے۔ اس کے اجرا کی متعدد تقریبات مختلف شہروں میں منعقد ہوئیں تو وہ گرتی ہوئی صحت کے باوجود ان میں شرکت کرتے رہے۔ ان کی تصانیف و تالیفات کی فہرست بہت طویل ہے، جس کی فہرست کا یہ محل نہیں، البتہ یہ ضرور ہے کہ جنوری ۲۰۲۴ء کے وسط تک تصنیف و تالیف میں مصروف رہے اور مختلف تقریبات میں شریک ہوتے رہے۔

نحیف و نزار تو پہلے ہی تھے، اس پر ہر سال ایک دو مرتبہ طبیعت اس قدر خراب ہوتی کہ جان کے لالے پڑ جاتے۔ ایسے مواقع پر وہ وصیت تک لکھوا دیتے، لیکن بفضلہٖ تعالیٰ جانبر ہو جاتے، البتہ اس مرتبہ علالت ایسی شدید تھی کہ کھانا پینا بند ہوگیا اور بول چال میں بھی دشواری پیش آنے لگی، چنانچہ وصیت نہ کر سکے اور محض ایک ہفتہ بیمار رہ کر ۲۵ رجنوری ۲۰۲۴ء کی شام خالق حقیقی سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تبصرۂ کتب

ڈاکٹر عبدالصبور ابوبکر، **فہم حدیث کے بنیادی اصول**، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد۔ صفحات: ۳۴۴۔ پتہ: مکتبہ سلفیہ ریوڑی تالاب بنارس یوپی۔ قیمت: ۴۳۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۲۳ء۔ موبائل نمبر: ۹۴۱۵۹۹۷۰۲۱۔

احادیث کے ردوقبول کے اصولوں سے صرف نظر کی وجہ سے ان کے عجیب وغریب مفہوم ومعنیٰ کو متعین کرنے کی کوششوں کا سنجیدگی سے مطالعہ اب وقت کی ضرورت ہے۔ اردو میں اس جانب بہت کم توجہ دی گئی ہے۔

مصنف نے اسی ضرورت کے پیش نظر کتاب میں فہم حدیث کے اصولوں کی اہمیت، افادیت، ضرورت اور شریعت سے اس کے تعلق کی وضاحت دو فصلوں میں کی ہے۔ پہلی فصل میں فہم کے لغوی و اصطلاحی معنیٰ اور فقہ وفہم وعلم میں فرق اور حدیث میں غلط فہمی کے اسباب اور اس کے سنگین نتائج کی نشاندہی کی گئی ہے۔ دوسری فصل میں سلف کی کتابوں سے حدیث فہمی کے بیس اصولوں کا استخراج کیا گیا ہے اور عربی اقتباسات مع ترجمہ پیش کیے گئے ہیں۔

ان اصولوں میں نص حدیث کا اثبات، احادیث صحیحہ کا باہم موازنہ ومقارنہ، مفاہیم کا فرق، سیاق و سباق اور شریعت کی رعایت وغیرہ تفصیلات تحقیق اور دیدہ ریزی سے پیش کی گئی ہیں معتبر شروحات حدیث کی طرف رجوع کے لیے قرآن کی آیت ''فسئلوا اھل الذکر ان کنتم لاتعلمون'' سے استناد کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ مشکل الفاظ ومعانی کی تفہیم کے لیے پیش رو محدثین کی توضیح کی جانب رجوع کرنا ضروری ہے۔

کتاب کا انداز محققانہ ہے۔ دعویٰ اور دلیل کے مستند ہونے پر توجہ ہے۔ فہم حدیث کے لیے عربی زبان اور حدیث کے مالہ وماعلیہ سے واقفیت کے بغیر جن نقصانات کا خطرہ ہے ان کو بھی اچھی طرح بیان کیا گیا ہے۔ انداز بیان میں اعتدال وتوازن ہے۔ علوم حدیث سے اشتغال رکھنے والوں کے لیے

اس کتاب کا مطالعہ ضروری اور مفید ہے۔

انجینئر فیروز مظفر، **مظفر حنفی کے تبصرے**۔ کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۲۰۸، پتہ: مظفر حنفی میموریل سوسائٹی، مظفر حنفی لین، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۲۳ء۔ موبائل نمبر ۹۳۱۰۳۶۵۳۷۳، ایمیل: er.ferozemuzaffar@gmail.com۔

مظفر حنفی کا علمی و ادبی سفر سات دہائیوں پر مشتمل ہے۔ اس طویل عرصہ میں انہوں نے ہر صنف ادب میں ایسے نقوش چھوڑے جن کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ تنقید و تحقیق اور شاعری میں ان کی اپنی جدا شناخت تھی۔ یہ اور بات ہے کہ جس اعتراف کے وہ حقدار تھے اس کا اظہار کامل طور پر نہیں ہوا۔ ان کے ادبی سرمایہ میں کتابوں پر ان کے تبصرے خاص طور پر شامل ہیں۔ ان کے مطالعہ کی وسعت، زبان و بیان پر گرفت، ہم عصر ناقدین کے نظریات کا تجزیہ اور صاف گوئی کے ساتھ غیر جانب دارانہ رویہ صاف نظر آتا ہے۔ بشیر فاروق کے دیوان حرف جنوں اور ظفر ادیب کی کتاب نئے خواب پر ان کے تبصرے ان کی تیکھی تنقید کے نمونے ہیں۔

زیر نظر کتاب کے سبھی تبصرے جاذب و دلکش ہیں۔ البتہ کہیں کہیں منفی، مداحانہ اور سرسری تبصروں کا بھی احساس ہوتا ہے۔ لیکن واحد پریمی کی گل نو اور شمس الرحمٰن فاروقی کی آسمان محراب پر تبصرے اگر جانب دارانہ مداحی کا احساس دلاتے ہیں تو مسدود راہوں کے مسافر، سنگ لرزاں، سرگوشیاں اور ظرافت اور تنقید پر تبصرے اپنے سرسری ہونے کی جانب توجہ دلاتے ہیں۔ شعری مجموعوں پر ان کے تبصرے زیادہ جاندار اس لیے ہیں کہ وہ خود شاعر ہیں اور شعر گوئی کی نزاکتوں اور باریکیوں سے واقف ہیں۔ کتابوں سے رشتہ قائم کرنے والوں کے لیے مظفر حنفی کے یہ تبصرے، نشان منزل کی صحیح رہنمائی کی عمدہ مثال ہیں۔

ک، ص اصلاحی

ادبیات

نعت

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی
نعمانی منزل، ہمدردنگر، بی. جمال پور۔علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲

ہوئی بعثت سے مصطفیٰؐ کی نصیب   نظم دوراں کو اک نئی ترتیب
آپؐ کے مرتبے کا کیا کہنا   آپؐ ہیں خالقِ جہاں کے حبیب
دونوں عالم میں ، آپؐ کا ثانی؟   بات کوئی نہ ہوگی اس سے عجیب
خاتم الانبیاؑ ہیں بے شک آپؐ   اب نہ آئے گا کوئی حق کا نقیب
سب یہ نام و نسب تعارف ہیں   اُنؐ کا جو ہوگیا وہی ہے نجیب
آپؐ نے جو سکھایا دنیا کو   ہے ثقافت وہی ، وہی تہذیب
دل میں الفت ہے شاہِؐ طیبہ کی   مرحبا، مرحبا، یہ دل کا نصیب
ہے مدینہ جہاں ، وہیں دل ہے   دل کی دنیا میں دور ہے ، نہ قریب
اللہ اللہ ، شانِ صدیقؓ   ثور میں جو رہے نبیؐ کے قریب
سب پہ روشن ہے عظمت فاروقؓ   تھے حبیبِ خدا کے آپؓ حبیب
شان عثمانؓ ہے بلند بہت   ہوئے دو نورِ خاص جن کو نصیب
مرتبہ ہے علیؓ کا بھی بالا   گرچہ چوتھے ، تھے از رہِ ترتیب

میں بھی دیکھوں گا اُنؐ کا روضہ رئیسؔ
ایک دن جاگے گا مرا بھی نصیب

☆

غزل

وارث ریاضی
کاشانۂ ادب، سکٹا (دیوراج) پوسٹ: بسوریا، مغربی چمپارن، بہار۔۸۴۵۴۵۳

وہ جب بھی ملے، بے دلی سے ملے ہیں
یہی کیا ہماری وفا کے صلے ہیں ؟

نہ قصرِ وفا آج تک ڈگمگایا
نہ محکم ستونِ عزائم ہلے ہیں

نئی زندگی ہے ، نئی آرزوئیں
نئے راہ بر ہیں ، نئے قافلے ہیں

مری جاں! بہار آگئی مے کدے میں
وہاں ناصحِ محترم بھی ملے ہیں

نہیں ہے شکایت ہمیں دشمنوں سے
نہ اپنوں کے جور و ستم پر گلے ہیں

زمانے کو نفرت ہے سچائیوں سے
ضمیر آج مردہ ہے، لب بھی سلے ہیں

نہ شرم و حیا ہے، نہ ہمت ، نہ جرأت
یہ قائد ہمارے بڑے بزدلے ہیں

چمن پر ہے زاغ و زغن کا تسلط
بہاروں میں ہر سمت کانٹے کھلے ہیں

ازل سے جہانِ محبت میں وارثؔ
ابھی تک ستم کے وہی سلسلے ہیں

☆

معارف کی ڈاک

''جزاور جزو کی بحث''

مارچ کے تازہ شمارے میں میرا ایک چھوٹا سا مضمون ''جز اور جزو کی بحث'' چھپا ہے۔اس مضمون میں ہمزہ کے واو سے بدل جانے پر ایک لسانی بحث ہے،اس وجہ سے بعض الفاظ پر گفتگو میں ان کی شکل اور حرکات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔سند کے طور پر عربی کے چند اشعار بھی آئے ہیں۔مضمون کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ کی مشکلات کا مجھے اندازہ تھا،اسی بنا پر میں نے مضمون کمپوز کروا کر اس کی ان پیج فائل بھیجی اور ساتھ ہی پی ڈی ایف فائل بھی۔

رسالہ چھپ کر آیا تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ متعدد الفاظ کا حلیہ بدلا ہوا ہے۔کئی جگہ عبارت غتر بود ہوگئی۔جس لفظ پر تشدید تھی اس کی تشدید غائب ہے اور جو لفظ مشدد نہیں تھا اس پر ایک تشدید براجمان ہے۔ایک شعر میں جو لفظ حاے حطی سے تھا وہ جیم سے لکھا ہوا ہے،اور اس کے بعد والے شعر میں اس کے برعکس جیم والا لفظ حاے حطی سے نظر آ رہا ہے۔غالب کے پہلے شعر کی ردیف بدل گئی حالانکہ حاشیے میں دیوانِ غالب کے نسخہ عرشی کا حوالہ موجود ہے۔موضوع بحث چونکہ ہمزہ تھا اس لیے مہموز الفاظ کی مختلف شکلوں میں جو غلطیاں ہوئیں ان سے اصل مطلب ہی خبط ہو گیا۔

تمہید میں میں نے لکھا تھا کہ ''بغیر ترکیب کے یہ لفظ تنہا آئے تو جز اور جزو دونوں کا استعمال عام ہے''۔معارف میں موخر الذکر (جزو) کو جو واو کے ساتھ تھا اسے ہمزے کے ساتھ (جزء) لکھ دیا اور بات کچھ کی کچھ ہو گئی۔اسی طرح فارسی لفظ (جز) کے معنی ''مگر'' لکھا تھا، وہ ''دیگر'' بن گیا!

صاف ظاہر ہے کہ مضمون دوبارہ کمپوز کیا گیا۔کیوں؟ یہ معلوم نہیں۔پی ڈی ایف فائل میں جیسا کہ سب جانتے ہیں یہ سہولت ہوتی ہے کہ اسے کمپیوٹر یا لیپ ٹاپ پر کھولیں تو جیسا چاہیں چھوٹا یا بڑا کر سکتے ہیں۔اس طرح الفاظ کے سارے حروف اپنے شوشوں اور حرکتوں کے ساتھ بالکل نمایاں ہو جاتے ہیں۔ظاہر ہے مضمون اسی پی ڈی ایف فائل سے کمپوز ہوا ہوگا، پھر اس کی پروف ریڈنگ بھی اسی کی مدد سے ہوئی ہوگی۔اس کے باوجود خدا جانے اتنی غلطیاں کیسے راہ پا گئیں!

اب مضمون کا غلط نامہ بھیجوں تو اندیشہ ہے کہ آگے اس غلط نامے کا غلط نامہ تیار کرنا پڑے گا۔ اس لیے صرف ایک غلطی کی جانب توجہ دلانا چاہتا ہوں کیوں کہ اس کا تعلق قرآن مجید سے ہے۔ میں نے لکھا تھا:

''دوسرا مصدر هُـزُؤ ہے، اس کا ہمزہ واو سے بدلا تو هُـزُوٌ بن گیا۔ یہی لفظ قرآن مجید میں گیارہ بار حالتِ نصب میں آیا ہے اور ہر جگہ حفص کی قراءت میں ''هُزُوًا'' واو کے ساتھ ہے''۔

معارف میں ص ۴۵ پر پہلے تو هُزُوٌ کی واو پر تنوین کے بجائے ہمزہ لکھ دیا اور عبارت بے معنی ہوگئی۔ اس لیے کہ یہ لفظ تو تبدیلی سے پہلے بھی اسی طرح تھا۔ پھر ''هُزُوًا'' کو ''هُزُؤ'' کر دیا یعنی واو پر ہمزہ لکھا اور نصب کی تنوین حذف کر دی۔ اس طرح قرآن مجید کے گیارہ مقامات کا جو حوالہ دیا گیا تھا وہ غلط ہو گیا اور اس کی بنیاد پر جو استدلال کیا گیا تھا وہ بھی بے بنیاد ٹھہرا۔

اگر مجھے ذرا بھی شبہ ہوتا کہ مضمون دوبارہ کمپوز ہوگا تو درخواست کرتا کہ اس کا آخری پروف مجھے بھیجا جائے۔ اس سے قبل میرے جو مضامین چھپتے رہے انہیں میں ہاتھ سے لکھ کر بھیجتا تھا اور ان کا پروف میرے پاس آتا تھا۔ اس بار کمپوز شدہ صورت میں پی ڈی ایف فائل کے ساتھ بھیج کر مطمئن تھا مگر افسوس کہ میری یہ تدبیر رائگاں گئی! معارف کے قارئین سے گزارش ہے کہ اب وہ یہ مضمون ٹیلی گرام کی اس لنک پر ملاحظہ فرمائیں: t.me/majmal1953

معارف کے اسی شمارے میں ایک مضمون یاقوت حموی کی معجم البلدان کے بارے میں شائع ہوا ہے۔ اس کے بارے میں سرِ دست صرف دو باتیں عرض ہیں:

(۱) ص ۲۳ اور ۲۵ پر تین حاشیوں میں ایک رسالے ''ماہنامہ دائرۃ المعارف'' کا حوالہ دیا گیا ہے مگر اس کے مقام اشاعت کا ذکر نہیں۔ اس نام کے کسی ماہنامے کی مجھے خبر نہیں تھی اس لیے اس نئی اطلاع پر خوشی ہوئی اور مزید معلومات حاصل کرنے کی خواہش بھی لیکن ص ۲۶ پر ایک حاشیے میں ''ماہنامہ معارف'' کا حوالہ نظر آیا اور تعجب ہوا کہ جلد اور شمارے کا نمبر وہی ہے جو سابقہ حوالوں میں ''ماہنامہ دائرۃ المعارف'' کا! اب یہ معلوم نہیں کہ مضمون نگار نے چاروں حواشی میں ''ماہنامہ معارف'' لکھا تھا اور ''ماہنامہ دائرۃ المعارف'' کمپوزنگ کی غلطی ہے، یا ص ۲۶ پر بھی انہوں نے ہی حسب سابق ''ماہنامہ دائرۃ المعارف'' لکھا تھا اور مرتبین معارف نے یہاں اصلاح کی ہے۔ اگر ایسا ہے تو گذشتہ تینوں حوالے تصحیح سے کیوں محروم رہے!

(۲) ص ۲۹ پر مضمون نگار نے یاقوت کی تصنیفات کی فہرست دی ہے مگر افسوس کہ اس کے لیے کسی ماخذ کا حوالہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس فہرست کی تیسری کتاب مراصد الاطلاع یاقوت کی نہیں ہے۔ یہ صفی الدین عبدالمومن بن عبدالحق بغدادی حنبلی (ف ۷۳۹ھ) کی تصنیف ہے اور تین جلدوں میں متداول ہے۔ چار تصنیفات (۶، ۱۴، ۱۵، ۲۱) دراصل ایک ہی کتاب کے مختلف نام ہیں۔ اسی طرح نمبر ۱، ۱۶ بھی۔ چھے تصنیفات (۴، ۷، ۱۳، ۱۹، ۲۰، ۲۱) کے نام غلط لکھے ہیں۔ سات کتابوں (۴، ۵، ۱۰، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰) کے بارے میں محترم مضمون نگار اگر اس ماخذ کا ذکر فرمائیں جس میں انہیں یاقوت حموی کی تصنیفات میں شمار کیا گیا ہے تو بڑی عنایت ہوگی۔

محمد اجمل اصلاحی

ریاض۔ سعودی عرب

معارف: ڈاکٹر محمد اجمل صاحب نے اپنے مضمون میں غلطیوں کا بجا شکوہ کیا ہے۔ بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر یہ کوتاہی ہوئی، جس پر ہمیں افسوس ہے۔

رامپور رضا لائبریری میں مغلیہ عہد کی یادگاریں

معارف، مارچ ۲۰۲۴ء میرے سامنے ہے۔ اس میں ڈاکٹر تبسم صابر صاحبہ کا مضمون "رامپور رضا لائبریری میں مغلیہ عہد کی یادگاریں (صفحات ۴۷-۵۲) دیکھا۔ اس مضمون کے بارے میں راقم السطور کے چند ملاحظات ہیں:

۱۔ مضمون نگار نے پورے مضمون میں مخطوطات کی تواریخ کتابت کے حوالے سے صرف عیسوی سنین درج کرنے کا التزام رکھا ہے اور ہجری سنین کو قطعاً نظر انداز کیا ہے۔ مشرقی اور اسلامی روایت میں جب ہم مخطوطات کے بارے میں لکھتے ہیں تو ان کی تصنیف اور کتابت کی تاریخیں درج کرنے میں ہجری تقویم کو اولیت حاصل ہوتی ہے کیونکہ یہی تاریخیں مخطوطات میں درج ہوتی ہیں محض جدید نسل اور ہجری تقویم سے ناواقف قارئین کی سہولت کے لیے عیسوی تقویم سے بھی مطابقت کر لی جاتی ہے۔ چونکہ

مضمون نگار نے ہجری تاریخوں کو نظر انداز کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ نہیں گلستان سعدی کے ایک نسخے کی تاریخ درج کرتے ہوئے ۳۲-۱۵۳۱ء لکھنا پڑا، گویا ایک کتاب دو سالوں میں کتابت ہوئی ہے! اگر وہ ساتھ ہجری سال لکھتیں تو یہ شائبہ نہ ہوتا۔

۲۔ مضمون نگار نے شاہجہان کی بیٹی نظر آراء کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس بیٹی کا ذکر کسی تاریخ میں نہیں ملتا (ص ۴۸) اگرچہ راقم السطور سردست اس کی تحقیق نہیں کر سکا لیکن یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ شاہ جہان کی اولاد میں سے صرف اسی بیٹی کا ذکر کسی بھی تاریخی کتاب میں نہ ہوا ہو۔

۳۔ نظامی گنجوی کو نظام گنجوی لکھنا سہو کتابت ہے (ص ۵۰)۔

۴۔ مضمون نگار نے مولانا عبدالرحمان جامی کے ایک باتصویر قلمی نسخے کا ذکر کیا ہے (ص ۵۰) لیکن اس نسخے کا نام یا عنوان نہیں لکھا۔

۵۔ بالمیکی رامائن کو بالمیکی نرائن لکھا گیا ہے (ص ۵۱)۔

۶۔ مجالس العشاق کو شہزادہ کمال الدین کی تصنیف قرار دیا گیا ہے (ص ۵۲)۔ یہ کتاب کمال الدین حسین گازرگاہی اور سلطان حسین بایقرا دونوں سے منسوب ہوتی چلی آرہی ہے۔ دیکھیے: دکتر مہدی بیلاقی، ''محرر مجالس العشاق سلطان حسین بایقرا''، نامہ بایسنغر، ہرات، شمارہ ۳، سال ۱۴۰۲ خورشیدی (۲۰۲۳ء) ص ۸۳-۱۱۱

۷۔ مضمون نگار نے دیوان خجند (ص ۵۲) کا ذکر کیا ہے۔ فارسی ادب میں اس نام کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ شاید مراد ''دیوان کمال خجندی'' ہے۔

عارف نوشاہی

ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد

naushahiarif@gmail.com

رسید کتب موصولہ

محمد ناصر سعید اکرمی، **آئینۂ فقہ**: مکتبہ ملت دیوبند، یوپی، صفحات: ۲۷۲، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۲۵۰/ روپے، موبائل نمبر: ۸۱۲۶۴۴۳۴۵۶

مولانا ابوالانوار محمد عبدالغفار عراقی، **اِلْـجَـامُ الْمُتَعَنِّتِين فِی تَعْدِيْل الأئِمَّةِ الْمَتْبُوعِین**: تحقیق ومراجعت: مولانا خورشید احمد قاسمی مظاہری، مظہر العلوم، بنارس، صفحات: ۴۴۶، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۴۱۵۸۸۴۵۵۱

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، **بیانِ شبلی (۴)**: نعیم بک سیلرز، مئو ناتھ بھنجن، صفحات: ۲۰۸، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت: ۳۵۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۴۵۰۷۵۵۸۲۰

مقصود احمد مقصود، **جذبات کی سوغات**: امرین بک ایجنسی، نزد کانچ کی مسجد، جمال پور احمد آباد، گجرات، صفحات: ۸۰، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت: ۱۴۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۸۲۴۰۳۳۷۱۰

ڈاکٹر مرضیہ عارف، **سفرنامے**: گھاٹی بھڑ بھونجہ روڈ، تلیا، بھوپال، صفحات: ۱۲۰، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۱۵۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۸۲۶۰۶۲۱۱۵

نعمت اللہ ندوی، **عارف عزیز، مشاہیر ومعاصرین کی نظر میں**: گلی نمبر ۱۴/۱، مکان ۶۰۰، بیرسیہ روڈ، عارف نگر، بھوپال، صفحات: ۴۴۹، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۴۰۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۸۹۳۱۶۷۸۸۲

ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی، **غالب اورالور**: غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، صفحات: ۳۸۸، سالِ اشاعت 2019ء، قیمت: ۳۰۰/روپے، ای میل: ghalibinstitute@gmail.com

ڈاکٹر عبید اقبال عاصم، **معارف القرآن ایک مطالعہ**: براؤن بکس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، صفحات: ۲۲۶، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۵۰۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۰۶۸۶۳۴۶۱۷

ڈاکٹر ٹی. آر. رینا، **مقالاتِ رشید حسن خاں (جلد سوم)**: لورہری سنگھ نگر، ریہاڑی کالونی، جموں، صفحات ۵۴۴، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت: ۵۵۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۴۱۹۸۲۵۴۴۲

ڈاکٹر فرید الدین ندوی، **مکتوب اکابر بنام حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی**: جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ، یو. پی، صفحات: ۳۸۷، سالِ اشاعت ۲۰۲۰ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۴۵۰۸۷۶۴۶۵

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبی (خاص ایڈیشن مکمل ۷ جلدیں)	2800/-	اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	125/-
مقدمہ سیرۃ النبی	30/-	سفرنامہ روم ومصر وشام	200/-
الفاروق	350/-	کلیات شبلی (اردو)	220/-
الغزالی	300/-	کلیات شبلی (فارسی)	--
المامون	175/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
سیرۃ النعمان	400/-	مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
شعر العجم اول	250/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
شعر العجم دوم	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
شعر العجم سوم	150/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
شعر العجم چہارم	200/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
شعر العجم پنجم	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری)	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن)		انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-
تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی	350/-	مکاتیب شبلی اول 〃 〃	--
خطبات شبلی	150/-	مکاتیب شبلی دوم 〃 〃	190/-
الکلام	350/-	اسلام اور مستشرقین چہارم	
علم الکلام	200/-	(علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

APR 2024 Vol- 211(4) ISSN 0974-7346 Ma'arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP- 43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم کتابیں

سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندوی	100/-
مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
مطالعاتِ شبلی	//	550/-
حیاتِ سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
شبلی شناسی کے اولین نقوش	ظفر احمد صدیقی	600/-
شبلی کی آپ بیتی	مرتبہ: ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
امام رازیؒ	مولانا عبدالسلام ندوی	320/-
حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندوی	600/-
تذکرۃ المحدثین اول	مولانا ضیاءالدین اصلاحی	200/-
تذکرۃ المحدثین دوم	//	225/-
تذکرۃ المحدثین سوم	//	300/-
محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	120/-
مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاءالدین اصلاحی	240/-
ابن رشد	محمد یونس فرنگی محلی	330/-
تاریخ اسلام اول ودوم (مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندوی	560/-
تاریخ اسلام سوم وچہارم (مجلد)	//	500/-
تاریخ صقلیہ اول ودوم (مجلد)	سید ریاست علی ندوی	800/-
تاریخ اندلس (چار جلدیں)	//	1200/-
اسلام میں مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	250/-
یہود اور قرآن	مولانا ضیاءالدین اصلاحی	150/-
تاریخ ارض القرآن	مولانا سید سلیمان ندویؒ	550/-